الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

حقوق ہمیشہ فرائض کی ادائیگی سے ملتے ہیں
نہ کہ حقوق کے نام پر لفظی چیخ پکار کرنے سے

شمارہ ۱۶۱
اپریل ۱۹۹۰

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ـ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ـ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہمِ قرآن کی کنجی ہے۔

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۱ اپریل ۱۹۹۰

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون : 697333, 611128

احتساب یا استقبال

اکسپریس ٹرین تیزی سے دہلی کی طرف بھاگی چلی جارہی تھی۔ گھڑی بتارہی تھی کہ اسٹیشن اب قریب آگیا ہے۔ فرسٹ کلاس ڈبہ میں ایک عورت اپنی چھوٹی بچی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ ماں اور بیٹی کے درمیان طرح طرح کی تفریحی باتیں جاری تھیں۔ اتنے میں بچی نے اپنی مخصوص زبان میں اپنی ماں سے کہا: ممی، نانی کا گھر کب آئے گا۔

بے خبر بچی صرف اپنی نانی کو جانتی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ "نانی کے گھر" جارہی ہے۔ مگر یہ اس کی سادگی تھی۔ کیوں کہ بچی اور دوسرے تمام مسافر حقیقۃً "خدا کے گھر" کی طرف جارہے تھے۔ دہلی ان کا درمیانی اسٹیشن تھا نہ کہ آخری اسٹیشن۔

آدمی اگر اس حقیقت کو جانے تو اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا کہ وہ انسانی ٹرین پر نہیں ہے، بلکہ وہ خدائی سواری پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس سواری کو کھینچنے والا کوئی دخانی یا کہربائی انجن نہیں، بلکہ یہ خدا کے فرشتے ہیں جو اس کو دنیا سے آخرت کی طرف لے جارہے ہیں۔

مسافروں میں اگر یہ احساس زندہ ہو تو ان کا حال کچھ سے کچھ ہوجائے۔ اس کے بعد جب وہ وقت آئے گا کہ ٹرین دہلی کے اسٹیشن پر رکے تو نادان بچی کے لیے اگرچہ وہ "نانی کا گھر" ہوگا جہاں اس کی نانی اس کا استقبال کرنے کے لیے پہلے سے اسٹیشن پر موجود ہوگی۔ مگر سچے مسافر کے لیے وہ خدا کا گھر ہوگا جہاں خدا کے فرشتے ہر آنے والے کو اپنے قبضہ میں لے رہے ہوں گے۔

آج کی دنیا میں ہر آدمی چھوٹی نادان بچی کی طرح بنا ہوا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی "نانی کے گھر" جارہا ہے۔ حالاں کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ "خدا کے گھر" کی طرف جارہا ہے۔ وہ استقبال کے اسٹیشن پر نہیں بلکہ احتساب کے اسٹیشن پر اترنے والا ہے۔

کتنا زیادہ فرق ہے لوگوں کی سوچ میں اور اصل حقیقت واقعہ میں۔ لوگ اپنے "اسٹیشن" پر استقبال کرنے والوں کی بھیڑ دیکھ رہے ہیں۔ حالاں کہ صحیح بات یہ تھی کہ انھیں اسٹیشن کے اوپر احتساب کرنے والے فرشتوں کا ہجوم نظر آنے لگے۔

بے خبری کی تمام قسموں میں یہ بے خبری سب سے زیادہ عجیب ہے۔

زندگی کی کھیتی

محمد ابن اسحاق (۱۵۱-۸۵ھ) کہتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ۴۰ سال پہلے کعبہ کے اندر ایک پتھر پایا تھا۔ اس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے :

مَن یزرع خیراً یحصد غبطة۔ ومَن یزرع شراً یحصد ندامة۔ تعملون السیئات وتجزون الحسنات۔ اجل۔ کما لا یُجتنیٰ من الشوك العنب۔

(سیرة ابن ہشام، الجزء الاول، صفحہ ۲۱۳)

جو شخص نیکی بوئے گا وہ قابلِ رشک فصل کاٹے گا۔ اور جو شخص برائی بوئے گا وہ شرمندگی کی فصل کاٹے گا۔ تم برائی کروگے اور اچھا بدلہ پاؤگے، ہاں ایسا نہیں ہوسکتا، جس طرح ببول کے پیڑ سے انگور توڑے نہیں جاسکتے۔

گمان غالب ہے کہ یہ کسی پیغمبرانہ کلام کا حصہ ہے جس کو عرب کے کسی صالح مرد نے ایک پتھر پر عربی زبان میں لکھا اور اس کو کعبہ کے اندر محفوظ کر دیا۔

ان الفاظ میں جو بات کہی گئی ہے، وہ ایک ابدی حقیقت ہے۔ وہ تمام پیغمبروں کی بات ہے۔ وہ قدیم انسان کے لیے بھی تھی، وہ آج کے انسان کے لیے بھی ہے۔ اور قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے لیے اس کی سچائی باقی رہے گی۔

نباتات کی دنیا میں اللہ تعالیٰ کا یہ ناقابل تغیر قانون نافذ ہے کہ پھول کی کھیتی سے پھول اگتا ہے اور کانٹے کی کھیتی سے کانٹا۔ اس ابدی قانون میں کوئی تبدیلی کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس انتہائی ظاہر اور معلوم قانون کے ذریعہ انسان کو ایک سنگین نوعیت کا عملی سبق دیا ہے۔ وہ یہ کہ نباتات کے لیے جو قانون ہے، وہی قانون انسان کے لیے ہے۔ جو شخص بھلائی کی فصل بوئے گا، وہ لازماً بھلائی کی فصل کاٹے گا۔ اسی طرح جو شخص برائی کی فصل بوئے گا، وہ لازماً برائی کی فصل کاٹے گا۔

انسان کو چاہیے کہ اس معاملہ میں وہ آخری حد تک چوکنا رہے۔ جو آدمی ایسا نہیں کرے گا، وہ ابدی طور پر حسرت اور ندامت کی آگ میں جلتا رہے گا، اور کوئی نہ ہوگا جو اس کو اس برے انجام سے بچا سکے۔

آنا اور جانا

کالون کولج (Calvin Coolidge) امریکہ کا ۳۰ واں صدر تھا۔ وہ ۴ جولائی ۱۸۷۲ کو پیدا ہوا، اور ۵ جنوری ۱۹۳۳ کو اس کی وفات ہوئی۔ ۱۹۲۴ میں اس نے نہایت آسانی سے صدارت کا الکشن جیت لیا تھا۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ تھی کہ وہ خطرناک انقلابیت (dangerous radicalism) کا مخالف بن کر کھڑا ہوا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جب وہ امریکہ کا صدر تھا، ایک شخص نے ظریفانہ طور پر اس سے پوچھا کہ وہائٹ ہاؤس میں کون رہتا ہے۔ صدر نے مختصر طور پر جواب دیا کہ کوئی نہیں، وہ بس آتے ہیں اور جاتے ہیں :

> The story goes that when Calvin Coolidge was the U.S. president a visitor facetiously asked him who lived in the White House. "No one," replied the incumbent laconically, "they just come and go."

کالون کولج نے جو بات امریکہ کی صدارتی رہائش گاہ (وہائٹ ہاؤس) کے بارہ میں کہی، وہ زیادہ کامل طور پر پوری دنیا کے لیے صحیح ہے۔ اس دنیا میں بظاہر بے شمار گھر بنے ہوئے ہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی شخص یا خاندان مقیم دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ سب صرف سطح کی باتیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی رہنے والا نہیں۔ ہر ایک بس آرہا ہے اور جا رہا ہے۔ اس دنیا کا کوئی مکان مکان نہیں۔ ہر مکان گویا ایک قسم کی عارضی سرائے ہے۔ یہاں لوگ صرف اس لیے آتے ہیں کہ وہ یہاں سے واپس چلے جائیں۔ یہاں لوگ صرف اس لیے بستے ہیں کہ دوبارہ انھیں یہاں کے گھروں میں بسنا نصیب نہ ہو۔

لوگ زندگی کو جانتے ہیں، مگر لوگ موت کو نہیں جانتے۔ لوگ "رہنے" سے واقف ہیں، مگر وہ "جاتے" سے واقف نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے لیے مکان بنا رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں کہ بالآخر انھیں جہاں رہنا ہے وہ جگہ وہ ہے جو خدا ان کے لیے مقرر کرے، نہ کہ وہ جگہ جو انھوں نے بطور خود اپنے لیے تعمیر کر رکھی ہے۔

کارساز

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ نومبر ۱۹۸۹) کے کالم اوپی نین (opinion) میں ایک عنوان نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اس کے الفاظ تھے —— میں لاپرواہ تھا مگر وہ نہ تھے:

I was careless; they were not

یہ نئی دہلی (فرینڈس کالونی ایسٹ) کے رہنے والے مسٹر کرشن کھنہ کا ایک تجربہ تھا جو مذکورہ سرخی کے ساتھ اخبار میں شائع ہوا۔ اس سرخی کے نیچے جو مختصر مضمون درج تھا، اس کا ترجمہ یہ ہے:

"میں کالکا سے دہلی کے لیے بذریعہ ٹرین سفر کر رہا تھا۔ میں نے لاپروائی میں اپنا پرس ریل کوچ کے اندر گرا دیا۔ میں نے سمجھا کہ اس کو کسی نے میری جیب سے نکال لیا ہے۔ مجھے کوئی امید نہ تھی کہ میرا پرس دوبارہ مجھے واپس ملے گا۔ اگلی صبح کو ایک ٹیلی فون آیا۔ یہ ناردرن ریلوے کے ڈویزنل منیجر کے دفتر سے تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرا پرس مل گیا ہے اور وہ ان کے پاس موجود ہے۔ انھوں نے پرس کے اندر رکھی ہوئی ایک شناختی سلپ کے ذریعہ مجھے جانا تھا۔ میں دفتر پہونچا تو میرے پرس کی تمام چیزیں پوری طرح محفوظ تھیں۔ افسر اور اس کے عملہ نے میرے ساتھ انتہائی خوش اخلاقی کا معاملہ کرتے ہوئے میرا پرس مجھے واپس دے دیا"

I was careless enough to drop my wallet in the rail coach I took from Kalka to Delhi. I took my pocket had been picked and had no hope of getting it back. The next morning came a telephone call from the office of Northern Railway's divisional manager to say it had been found. They located me by an identity slip in it. All the contents were intact and I was treated with utmost courtesy by the officer and his staff. (Krishen Khanna)

میں نے اس خبر کو پڑھا تو مجھے کسی فارسی شاعر کا وہ شعر یاد آگیا جو اس نے خدا اور بندے کی نسبت سے کہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا خدا زیادہ بہتر طور پر ہماری کارسازی کر رہا ہے:

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما　　فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

حقیقت یہ ہے کہ یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی بندہ اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرکے یہ کہہ اٹھے کہ —— خدایا، انا عند ظن عبدی بی کے مطابق، میں

نے تیرے ساتھ یہ گمان قائم کیا ہے کہ تو میری فکر کرے گا جب کہ میں بے فکر ہو جاؤں۔ تو مجھے یاد رکھے گا جب کہ میں بھول جاؤں۔ تو مجھے سنبھالے گا جب کہ میں پھسلنے لگوں۔ تو میری کارسازی کرے گا جب کہ میں غفلت میں پڑ جاؤں۔ تو میرے لیے جاگے گا جب کہ میں سو جاؤں۔ تو مجھے بخش دے گا جب کہ میں غلطی اور کوتاہی کروں۔

جب کوئی بندہ اس طرح خدا کو اپنا رب بنائے تو خدا بھی اسی طرح اُس کو اپنا بندہ بنا لیتا ہے جیسا کہ اس نے اپنے رب کے ساتھ گمان کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں، وہ سب سبق کے لیے پیش آتے ہیں۔ مذکورہ بالا قسم کے واقعات بھی دراصل اسی لیے ہیں کہ انسان ان سے سبق حاصل کرے۔ وہ انسانی واقعہ میں خدائی معاملہ کی جھلک پالے۔ وہ وقتی تجربہ میں اس مستقل اور پائیدار تعلق کا تجربہ کر لے جو بندہ اور خدا کے درمیان قائم ہوتا ہے، جس کو کبھی ٹوٹنا نہیں ہے۔ جس کا سلسلہ دنیا سے آخرت تک چلا جاتا ہے۔

خدا بلاشبہ سب سے بڑا کارساز ہے۔ مگر وہ اسی شخص کا کارساز بنتا ہے جو اس کو اپنا کارساز بنائے۔ جو اس پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔

اتھاہ امکانات

افغانستان کے سفر (اکتوبر ۱۹۸۸) میں ایک دلچسپ چیز دیکھنے کو ملی جو اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھی تھی۔ اس کو عام زبان میں فِش (fish) کہا جاتا ہے۔ یہ امریکی ساخت کے اس خطرناک ہتھیار کا توڑ ہے جس کو اسٹنگر (stinger) کا نام دیا گیا ہے۔ فش کا حربہ استعمال کرنے کو فشنگ (fishing) کہتے ہیں۔

افغانستان میں روسی فوجوں کے داخلہ (دسمبر ۱۹۷۹) کے بعد روسیوں اور افغان مجاہدین کے درمیان مستقل جنگ شروع ہو گئی۔ افغان مجاہدین صرف زمینی طاقت کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب کہ روسیوں کا حال یہ تھا کہ وہ ہیلی کاپٹر پر اڑ کر ان کے ٹھکانوں کو اپنے بم کا نشانہ بناتے تھے۔

یہ بے حد نازک صورت حال تھی۔ افغانی مجاہدین اگرچہ گن کے ذریعہ جہازوں کو مارنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر گن سے نکلی ہوئی گولی بالکل سیدھی جاتی ہے۔ اس لیے ایک ایسی چیز جو تیز رفتاری کے ساتھ فضا میں متحرک ہو، اس کو گولی کا نشانہ بنانا بے حد دشوار ہے۔ چنانچہ افغانی مجاہدین کوشش کے باوجود، روس کے بمبار جہازوں کو مار گرانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔

اس وقت امریکہ نے افغانی مجاہدین کو جدید قسم کا اینٹی ایر کرافٹ میزائل سپلائی کیا، جس کو اسٹنگر (stinger) کہا جاتا ہے۔ اب افغانی مجاہدین کو روس کے بمبار جہازوں پر واضح بالادستی حاصل ہو گئی۔ وہ جب بھی فضا میں روسی جہاز دیکھتے تو اس پر اسٹنگر داغ دیتے، اور اسٹنگر پیچھا کر کے جہاز کو مارتا۔ کیوں کہ اسٹنگر عام گولے کی طرح بالکل سیدھا نہیں جاتا۔ وہ جہاز کے رخ پر اپنا رخ بدلتا ہوا جاتا ہے اور اس کو بہر حال مار کر رہتا ہے۔

پہلے اگر افغانی مجاہدین دفاعی حیثیت میں تھے تو اب روسی فضائیہ دفاعی حیثیت میں آگیا۔ مگر اس دنیا میں امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ کوئی بھی ایجاد اگلی زیادہ بڑی ایجاد کے امکان کو ختم نہیں کرتی۔ چنانچہ روسیوں نے بہت جلد اسٹنگر کا توڑ دریافت کر لیا۔ اسی توڑ کا نام "فش" ہے۔ روسیوں نے معلوم کیا کہ اسٹنگر کی ٹکنیک یہ ہے کہ وہ گرمی کی طرف بھاگتا ہے۔ چونکہ اس وقت

فضا میں سب سے زیادہ گرم چیز ہوائی جہاز کا انجن ہوتا ہے اس لیے وہ اس کا پیچھا کر کے انجن سے ٹکرا جاتا ہے، اس طرح وہ جہاز کو برباد کر دیتا ہے۔

روسیوں نے اسٹنگر کے توڑ میں "فش" کو دریافت کیا۔ یہ خاص قسم کا کیمیائی مادہ ہے جو ہوائی جہاز سے باہر آتے ہی جل اٹھتا ہے اور تیز شعلہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس شعلہ کی گرمی ہوائی جہاز کے انجن کی گرمی سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہوائی جہاز کی طرف چلایا ہوا اسٹنگر ہوائی جہاز سے ٹکرانے کے بجائے شعلہ (فش) کی طرف جا کر اس سے ٹکرا جاتا ہے۔ اس طرح ہوائی جہاز اس کی زد سے بچ جاتا ہے۔

اس واقعہ میں ایک بے حد اہم نکتہ ہے۔ اور وہ ہے فریق ثانی کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا۔ مقابلہ کی اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو فریق ثانی کی کمزوری کو دریافت کر سکیں اور اس سے فائدہ اٹھانے والی اہلیت کا ثبوت دیں۔

روسیوں نے اس معاملہ میں اسی اہلیت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اسٹنگر کی اس "کمزوری" سے فائدہ اٹھایا کہ وہ اپنے اندر انسانی عقل نہیں رکھتا۔ اس کی ضرب شعوری ضرب نہیں ہے، وہ ایک میکانکی ضرب ہے۔ وہ ایک مادی چیز ہونے کی وجہ سے ہوائی جہاز کو نہیں جانتا۔ وہ "گرمی" کو نشانہ بنانا جانتا ہے نہ کہ "ہوائی جہاز" کو۔ روسیوں نے جیسے ہی اس راز کو دریافت کیا، انھوں نے گویا آدھی جنگ جیت لی۔ اسٹنگر کے مقابلہ میں فش کا استعمال اسی تدبیر کی ایک کامیاب مثال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا توڑ ہے۔ یہاں خطرات کے مقابلہ میں ہمیشہ امکانات کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ بشرطیکہ مسائل پیش آنے کے بعد آدمی اپنی ہمت کو نہ کھوئے۔ وہ خدا کی دی ہوئی عقل کو استعمال کر کے خطرہ کا توڑ دریافت کر سکے۔

یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ لن یغلب عسرٌ یسرین (ایک مشکل دو آسانی پر ہرگز غالب نہیں آسکتی)، یعنی اس دنیا میں اگر عسر (مشکل) ایک ہے، تو اس کے مقابلہ میں یسر (آسانی) کی مقدار اس کا دگنا ہے۔ یہاں اگر ایک راستہ میں رکاوٹ حائل ہوتی ہے تو وہیں دوسرا راستہ آگے بڑھنے کے لیے کھلا ہوا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں فریاد اور احتجاج نہ صرف بے فائدہ ہے، بلکہ وہ خود خدا کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ یہ خدا کی خدائی کی تصغیر ہے۔ فریاد و احتجاج کرنے والا شخص بیک وقت دو نقصان کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی ناکامی کو دوبارہ کامیابی بنانے کے امکان کو استعمال کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خدا کی نظر میں اس بات کا مجرم قرار پاتا ہے کہ اس نے ایک کامل دنیا کو ناقص دنیا بتانے کی جسارت کی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا اتھاہ امکانات کی دنیا ہے۔ ماضی کی کوئی کوتاہی مستقبل کے مواقع کو برباد نہیں کرتی۔ دشمن کی کوئی کارروائی ایک نئی برتر کارروائی کے امکان کو ختم نہیں کرتی۔ ہر نقصان کے بعد یہ موقع بدستور باقی رہتا ہے کہ آدمی از سر نو کوشش کرکے دوبارہ اپنے آپ کو کامیاب بنالے۔

آدمی کو چاہیے کہ وہ پیچھے کی طرف دیکھنے کے بجائے آگے کی طرف دیکھے۔ وہ ہر کھونے کے بعد دوبارہ پانے کی کوشش کرے۔ وہ ہاری ہوئی بازی کو محنت اور عمل کے ذریعہ از سر نو جیت لے۔

فطری حقیقت

سی ایف ڈول (C.F. Dole) نے کہا ہے کہ ـــــــ مہربانی کا برتاؤ دنیا میں سب سے بڑی عملی طاقت ہے :

Goodwill is the mightiest force in the universe.

یہ محض ایک شخص کا قول نہیں ، یہ ایک فطری حقیقت ہے ۔ انسان کے پیدا کرنے والے نے انسان کو جن خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے ، ان میں سے اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ کسی آدمی کے ساتھ برا سلوک کیا جائے تو وہ بپھر اٹھتا ہے ، اور اگر اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے تو وہ احسان مندی کے احساس کے تحت سلوک کرنے والے کے آگے بچھ جاتا ہے ۔

اس عام فطری اصول میں کسی بھی شخص کا کوئی استثنار نہیں ۔ حتیٰ کہ دوست اور دشمن کا بھی نہیں ۔ آپ اپنے ایک دوست سے کڑوا بول بولئے ۔ اس کو بے عزت کیجئے ۔ اس کو تکلیف پہونچایئے ۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد فوراً وہ ساری دوستی کو بھول گیا ہے ۔ اس کے اندر اچانک انتقامی جذبہ جاگ اٹھے گا ۔ وہی شخص جو اس سے پہلے آپ کے اوپر پھول برسا رہا تھا ، اب وہ آپ کے اوپر کانٹا اور آگ برسانے کے لیے آمادہ ہو جائے گا ۔

اس کے برعکس ایک شخص جس کو آپ اپنا دشمن سمجھتے ہیں ، اس سے میٹھا بول بولئے ۔ اس کی کوئی ضرورت پوری کر دیجئے ۔ اس کی کسی مشکل کے وقت اس کے کام آجایئے ۔ حتیٰ کہ پیاس کے وقت اس کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجئے ۔ اچانک آپ دیکھیں گے کہ اس کا پورا مزاج بدل گیا ہے ۔ جو شخص اس سے پہلے آپ کا کھلا دشمن دکھائی دے رہا تھا ، وہ آپ کا دوست اور خیر خواہ بن جائے گا ۔

خدا نے انسان کی فطرت میں یہ مزاج رکھ کر ہماری عظیم الشان مدد کی ہے ۔ اس فطرت نے ایک نہتے آدمی کو بھی سب سے بڑا تسخیری ہتھیار دے دیا ہے ۔ اس دنیا میں شیر اور بھیڑیے کو مارنے کے لیے گولی کی طاقت چاہیے ، مگر انسان کو زیر کرنے کے لیے کسی گولی کی ضرورت نہیں ۔ اس کے لیے حسن سلوک کی ایک پھوار کافی ہے ۔ کتنا آسان ہے انسان کو اپنے قابو میں لانا ۔ مگر نادان لوگ اس آسان ترین کام کو اپنے لیے مشکل ترین کام بنا لیتے ہیں ۔

اُس دن

قرآن میں آخرت کے بارہ میں بتایا گیا ہے کہ جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور لوگ سجدہ کرنے کے لیے بلائے جائیں گے تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے۔ (یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون، القلم) یہاں کشفِ ساق (پنڈلی کھولنے) کا لفظ استعارہ کے طور پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ تمام حقیقتیں کھول دی جائیں گی جو موجودہ دنیا میں امتحان کی مصلحت سے چھپا دی گئی ہیں۔ العوفی نے عبداللہ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس آیت کی تشریح میں کہا کہ جب معاملہ سے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور تمام اعمال ظاہر ہو جائیں گے (حین یکشف الامر وتبدو الاعمال، تفسیر ابن کثیر)

جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لیے یا ذاتی فائدہ کے لیے دینی زندگی اختیار کرے وہ جھوٹا دیندار ہے۔ مگر دنیا میں یہ حقیقت چھپی رہتی ہے۔ اس لیے یہاں جھوٹے دیندار کو بھی وہی عزت مل جاتی ہے جو سچے دیندار کو ملنی چاہیے۔ مگر آخرت میں اس قسم کا فریب ممکن نہ ہوگا۔ آخرت کے بدلے ہوئے حالات میں ایسے لوگ بالکل بے جگہ ہو جائیں گے۔ دنیا میں بناوٹی باتیں کرکے مقبولیت حاصل کرنے والے آخرت میں اپنے آپ کو بے زبان محسوس کریں گے، کیوں کہ آخرت میں تمام اہمیت صرف قولِ سدید کی ہوگی، اور اس قسم کے کلام کے لیے وہ لوگ اپنے آپ کو وہاں نااہل پائیں گے۔ مادی چیزوں کی بنیاد پر بڑائی حاصل کرنے والے وہاں چھوٹے ہو جائیں گے، کیوں کہ آخرت میں صرف روحانی چیزوں میں عظمت ہوگی۔ دوسری تمام چیزیں اس روز اپنی عظمت کھو دیں گی۔ غیر حقیقی مسائل کا نعرہ لگا کر بھیڑ جمع کرنے والے وہاں تنہا ہو جائیں گے، کیوں کہ آخرت میں لوگوں کی توجہ کا مرکز صرف وہ چیزیں ہوں گی جو حقیقی طور پر بامعنی حیثیت رکھتی ہوں۔

دنیا میں آدمی سچائی کو نظر انداز کرکے اونچے مقامات پاتا ہے، آخرت میں سچائی کا اعتراف کرنے والا اونچے مقامات کو پائے گا۔ دنیا میں خیانت کرکے آدمی مال کا مالک بنتا ہے، آخرت میں دیانت و امانت وہ چیز ہوگی جو آدمی کو صاحبِ سرمایہ بنائے۔ دنیا میں انسانوں کو خوش کرکے مفادات حاصل ہوتے ہیں، آخرت میں خدا کو خوش کرنا آدمی کو تمام مفادات کا مالک بنائے گا۔

تجارتی شرکت

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ مکہ کے لوگ اس زمانہ میں زیادہ تر تجارت کیا کرتے تھے۔ آپ نے بھی نبوت سے پہلے تجارت فرمائی اور اس سلسلہ میں لوگوں کے ساتھ شرکت کے معاملات کیے۔ اس سلسلہ میں کچھ واقعات سیرت اور حدیث کی کتابوں میں نقل کیے گیے ہیں۔

عبداللہ بن سائب مکہ کے باشندہ تھے۔ انھوں نے بعد کو اسلام قبول کیا۔ عبداللہ بن سائب کہتے ہیں کہ میں جاہلیت کے زمانہ میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا شریکِ تجارت تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ آکر میں آپ سے ملا۔ آپ نے پوچھا کہ مجھ کو پہچانتے ہو۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ آپ کے ساتھ تو میری تجارتی شرکت تھی۔ اور آپ کتنے اچھے شریک تھے۔ آپ نہ کبھی دھوکا دیتے تھے اور نہ کسی بات پر جھگڑتے تھے (کنت شریکی فنعم الشریك لاتداری ولاتماری)

اسی طرح قیس بن سائب مخزومی کہتے ہیں کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں آپ کی شرکت میں تجارت کی ہے۔ آپ بہترین شریک تجارت تھے۔ آپ نہ جھگڑتے تھے اور نہ کسی قسم کا منافشہ کرتے تھے (وکان خیر شریك لایماری ولایشاری)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاجرانہ شرکت کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے اور اس کو برقرار رکھنے کے لیے کیا چیز درکار ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں ——— باہمی اعتماد کو باقی رکھنا، اور نظرانداز کرنے کی پالیسی اختیار کرنا۔

جب بھی دو یا دو سے زیادہ آدمی مل کر کاروبار کریں تو ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ایک آدمی دوسرے کو فریب دے کر ذاتی نفع حاصل کرے۔ ایسی روش شریکوں کے درمیان اعتماد کو ٹھیس پہونچاتی ہے۔ اور شرکت کو برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جو شخص تجارتی شرکت کو باقی رکھنا چاہتا ہو، اس پر لازم ہے کہ وہ ایسے ہر فعل سے انتہائی حد تک اپنے آپ کو بچائے۔

اسی طرح تاجرانہ شرکت میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اختلافی صورت پیش آتی ہے۔ ایسے مواقع پر نزاع اور تکرار سے بچ کر وسعت ظرف کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اختلافی مسائل پر نزاع سے شرکت ٹوٹتی ہے۔ اور اختلافی مسائل میں عالی ظرفی کا طریقہ اختیار کرنے سے شرکت برقرار رہتی ہے۔

اسلام کی اشاعت

پیٹرک ریان (Patrick Ryan) نے لکھا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے بعد اسلام کی غیر معمولی اشاعت زیادہ تر تاجروں (ٹریڈرس) اور صوفیوں کے ذریعہ ہوئی۔ اسلام کی اشاعت کا مقصد انھوں نے اس طرح حاصل کیا کہ وہ مشترک سماج میں خدا اور رسول کے تابع بن کر رہے۔ حتی کہ بعض اوقات ایسے ماحول میں بھی جو ان کے لیے غیر ہمدرد تھا۔ جو چیز بالآخر اس کا سبب ہوئی کہ ان کا ماحول بدل کر دارالاسلام بن جائے، وہ مسلم اقلیت کی عسکریت نہ تھی بلکہ خود غیر مسلم اکثریت کی اسلام میں وہ دلچسپی تھی جس کو انھوں نے پرامن اور پرکشش مذہب کی حیثیت سے دریافت کیا:

> This they achieved by learning to live lives of submission to God and to His messenger in a pluralistic, sometimes even unsympathetic environment. What eventually contributed to that environment changing to a 'realm of Islam' (Dar al-Islam) was not the militancy of the Muslim minority but the religious interest of the non-Muslim majority in what they came to recognize as a peaceful and attractive form of faith.
>
> Patrick Ryan, *Islam and Politics in West Africa: Minority and Majority Models*, Quoted by *The Muslim World*, January 1987, p. 6.

عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ بعد کی صدیوں میں اسلام کی عالمی اشاعت زیادہ تر تاجروں اور صوفیوں کے ذریعہ ہوئی۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلم تاجروں یا مسلم صوفیوں نے باقاعدہ یا منظم صورت میں اسلام کی تبلیغ کی۔ تاریخ سے اس قسم کی تبلیغی کوشش کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ تاجروں اور صوفیوں کے زمانہ میں اسلام کا پھیلنا بجائے خود ایک تاریخی واقعہ ہے۔ مگر ان تاجروں اور صوفیوں کا باقاعدہ تبلیغی عمل کرنا کوئی ثابت شدہ تاریخی واقعہ نہیں۔

ایسی حالت میں ان کے زمانہ میں اسلام کے پھیلنے کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب سادہ طور پر صرف یہ تھا کہ اس زمانہ میں وہ چیز ظہور میں نہیں آئی تھی جس کو موجودہ زمانہ میں احتجاجی سیاست کہا جاتا ہے۔ احتجاجی سیاست جس کو موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے تقریباً تمام دنیا میں کسی نہ کسی طور پر اختیار کر رکھا ہے، یہی اسلام کی اشاعت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ یہ احتجاجی یا مخالفانہ سیاست داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور کھنچاؤ کا ماحول پیدا کرتی ہے۔ اور نفرت اور کھنچاؤ کے ماحول میں کبھی اسلام کی اشاعت نہیں کی جاسکتی۔

صدر اول میں جو انقلاب آیا اور جس طرح اسلام کی عظیم تاریخ بنی، اس نے اب اسلام کو ایک طاقت ور سیلاب کی حیثیت دیدی ہے۔ اب اسلام اپنے آپ پھیلنے کی طاقت رکھتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہناؤں کی جھوٹی سیاست نے اسلام کے سیلاب کی راہ میں نفرت کا روک کھڑا کر دیا ہے۔ اس روک کو دور کر دیجئے۔ اس کے بعد اسلام اپنے آپ پھیلنے لگے گا۔

قدیم زمانہ کے تاجروں اور صوفیوں نے یہی کیا تھا۔ وہ خاموش اور سادہ انداز میں زندگی گزارتے تھے۔ وہ مدعو قوموں سے کوئی نزاع نہیں کھڑی کرتے تھے۔ ان کی بے نزاع زندگی نے اسلامی سیلاب کی راہ سے رکاوٹ کو دور کر رکھا تھا۔ چنانچہ اسلام اپنے آپ پھیلتا جارہا تھا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈر تاریخ کا وہ پہلا گروہ ہیں جنھوں نے اپنی جھوٹی سرگرمیوں سے اسلام کے اشاعتی سیلاب کے آگے نفرت کا بند کھڑا کر دیا، اور اس طرح اسلام کے اشاعتی سیلاب کو روک دیا۔

آج مسلم قوموں میں دوبارہ وہی روح پیدا کرنے کی ضرورت ہے جس کو پیٹرک ریان نے بجا طور پر ماضی میں اسلام کی اشاعت کا سبب قرار دیا ہے۔ یعنی دوسری قوموں کے درمیان ٹکراؤ کے بجائے مفاہمت کے انداز میں رہنا۔

دوسری قوموں سے مسلمانوں کا ٹکراؤ کن چیزوں میں ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تر سیاسی، اقتصادی اور سماجی نوعیت کے معاملات میں ہوتا ہے۔ ان معاملات میں مسلمان اگر نزاع کا انداز اختیار کریں تو داعی اور مدعو کے درمیان کش مکش برپا ہوتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دوسری قوموں میں اسلام کی اشاعت رک جاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر مسلمان اس قسم کے دنیوی امور میں صبر اور اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو داعی اور مدعو کے تعلقات میں خوش گواری آتی ہے۔ دوسری قومیں ہمدردانہ ذہن کے ساتھ اسلام کو دیکھتی ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ اسلام کی خوبیوں سے متاثر ہوتے ہیں اور آخر کار اسلام قبول کر لیتے ہیں ——— دنیوی نقصانات پر صبر کرنے سے اسلام کی اشاعت کا دروازہ کھلتا ہے، اور دنیوی نقصانات پر صبر نہ کرنا اسلام کی اشاعت کے دروازہ کو بند کر دیتا ہے۔

سب سے بڑا فتنہ

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کے سامنے تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ اس امت کے لیے میں سب سے زیادہ جس سے ڈرتا ہوں وہ منافق عالم ہے۔ لوگوں نے اس کی بابت مزید پوچھا تو حضرت عمر نے جواب دیا کہ عالم اللسان، جاہل القلب (حیاۃ الصحابہ، الجزء الثالث، صفحہ ۲۶۶)

ایک شخص اندھا ہے۔ اس کے پاس ہاتھ ہے جس سے وہ پکڑے، مگر اس کے پاس آنکھ نہیں جس سے وہ دیکھے۔ ایسے آدمی کے ہاتھ میں ایک ہیرا دیدیا جائے تو کیا ہوگا۔ وہ ہیرے کو ٹٹول کر ہیرے کی سختی کو جان لے گا۔ مگر وہ ہیرے کی چمک کو نہ جان سکے گا۔ کیوں کہ ہیرے کی چمک اور اس کی خوبصورتی کو جاننے کے لیے آنکھ کی ضرورت ہے، اور آنکھ اس کے پاس موجود ہی نہیں۔

یہی معاملہ کسی آدمی کا اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے پاس بصارت ہو مگر اس کے پاس بصیرت نہ ہو۔ اس کے پاس ذہنی علم ہو مگر اس کے پاس قلبی معرفت نہ ہو۔ یہی وہ انسان ہے جس کی بابت حضرت عمر نے فرمایا کہ وہ زبان کا عالم مگر قلب کا جاہل ہوگا۔

ایسا آدمی قرآن وحدیث کو پڑھے گا مگر وہ کہیں کی بات کہیں جوڑ دے گا۔ کیوں کہ اس کے پاس صرف الفاظ کا ذخیرہ ہے، وہ معانی کی گہرائیوں سے واقف نہیں۔ وہ اسلام کے نام پر تحریک چلائے گا مگر وہ بے لگام گھوڑے کی طرح کسی بھی سمت میں دوڑنا شروع کر دے گا۔ کیوں کہ اس کو راستوں کی پہچان حاصل نہیں۔

ایسا شخص بے اعترافی کا کمال دکھائے گا مگر وہ اعتراف کا ثبوت نہ دے سکے گا، کیوں کہ وہ اعتراف کی لذت سے آشنا نہیں۔ وہ بے صبری کا مظاہرہ کرے گا مگر وہ صبر کی روش اختیار نہ کر سکے گا، کیوں کہ وہ صبر کی اہمیت کو نہیں جانتا۔ وہ اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے مسائل کو فوراً سمجھ لے گا مگر ملت سے تعلق رکھنے والے مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہے گا، کیوں کہ اس کے سینہ میں اپنی ذات کا درد تو ہے مگر اس کے سینہ میں ملت کا درد نہیں ــــــ جو لوگ الفاظ کے عالم اور معانی کے جاہل ہوں وہ بلاشبہ سب سے بڑا فتنہ ہیں، امتِ مسلمہ کے لیے بھی اور وسیع تر معنی میں ساری انسانیت کیلئے بھی۔

ایک آیت

رزین نے زید بن اسلم سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک روز پانی مانگا۔ ان کے پاس ایک پیالہ میں پانی لایا گیا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ اچھا ہے۔ مگر مجھے قرآن کی آیت (الاحقاف ۲۰) یاد آتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت میں کچھ لوگوں سے کہا جائے گا کہ تم اپنی اچھی چیزیں دنیا میں لے چکے۔ اب آخرت کی اچھی چیزوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ وہی نہ ہو۔ حضرت عمر نے یہ کہا اور پیالہ پیے بغیر واپس کر دیا۔ (التفسیر المظہری)

مذکورہ آیت کے تحت اکثر تفسیروں میں اس طرح کے واقعات درج ہوتے ہیں۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ تاثر لے لیا گویا دنیا کی طیبات کو استعمال کرنا مطلق طور پر آخرت کی طیبات سے محرومی کے ہم معنی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک خاص موقع پر شہد کا شربت نہ پینا محض شدتِ تاثر کی بنا پر تھا۔ وہ شرعی حکم کے طور پر نہ تھا بلکہ تقویٰ کے احساس کے تحت تھا۔

حدیث میں آیا ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک متقی کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ (بعض اوقات) ایسی چیز کو بھی چھوڑ دے جس میں حرج نہیں ہے، اس اندیشہ کی بنا پر کہ شاید اس میں حرج ہو (لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا بأس به حذراً لما به بأس)

حضرت عمر کے مذکورہ فعل کو اسی حدیث کے تحت دیکھنا چاہیے۔ یہ واقعہ ان کی بڑھی ہوئی متقیانہ حساسیت کی بنا پر پیش آیا نہ اس لیے کہ دنیا کی اچھی چیزیں اہلِ ایمان کے لیے قابلِ ترک ہیں۔

اگر دنیا کی اچھی چیزوں کو مطلقاً قابلِ ترک سمجھا جائے تو یہ نظریہ قرآن کی ان آیتوں سے ٹکرا جائے گا جن میں طیب اور پاک چیزوں کو مطلق طور پر اہل ایمان کے لیے جائز بتایا گیا ہے۔ حتی کہ ارشاد ہوا ہے کہ کہو، اللہ کی زینت کو کس نے حرام ٹھہرایا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اور کھانے کی طیب (پاک) چیزیں۔ کہو کہ وہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور آخرت میں تو وہ خاص انھیں کے لیے ہوں گی (الاعراف ۳۲)

ابدی ذلت

مفسر ابن کثیر (م ۷۷۴ ھ) نے بعض علمار کا قول نقل کیا ہے کہ شرم کرنے والا اور مغرور کبھی علم حاصل نہیں کر سکتا۔ کچھ اور علمار نے کہا کہ جو شخص ایک گھڑی کے لیے علم سیکھنے کی ذلت برداشت نہیں کرے گا، وہ ہمیشہ جہالت کی ذلت میں رہے گا (قال بعض السلف لاينال العلم حيي ولا مستكبر- وقال آخر من لم يصبر على ذل التعلم ساعة بقي في ذل الجهل ابداً، تفسیر ابن کثیر، الجزء الثانی، صفحہ ۲۴۷)

ایک شخص بے علمی میں پڑا ہوا ہے، یا ناواقفیت کی بنا پر ایک غلط رائے قائم کیے ہوئے ہے۔ اب ایک علم والا اس کے سامنے آتا ہے۔ اس کے لیے موقع ہوتا ہے کہ وہ علم والے سے علم سیکھے۔ اور واقف کار سے معلومات لے کر اپنی غلط فکری کو صحیح کرلے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ وہ علم والے کو علم والا مانتے ہوئے اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہل آدمی اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ مان لیا کہ میں نہیں جانتا تھا، اور اب فلاں شخص کے ذریعہ مجھے اس کا علم حاصل ہوا ہے تو اس سے میری عزت میں کمی آجائے گی۔ میں جو اب تک لوگوں کی نظر میں "جاننے والا" بنا ہوا تھا، اچانک لوگوں کی نظر میں "نہ جاننے والا" بن جاؤں گا۔ وہ علم کے مسئلہ کو معرفت کا مسئلہ نہ بنا کر اس کو وقار (prestige) کا مسئلہ بنا لیتا ہے اور پھر یا تو اس کو نظر انداز کرتا ہے، یا کھلے طور پر اس کا انکار کر دیتا ہے۔

ایسا آدمی وقار کو بچانے کے نام پر ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو بے وقار بنا رہا ہے۔ وہ وقتی بے عزتی سے بچنے کی خاطر ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو عزت اور احترام سے محروم کر رہا ہے۔ ایسا آدمی دنیا میں باعتبار حقیقت ذلیل ہے۔ آخرت میں وہ حقیقت اور واقعہ دونوں کے اعتبار ذلیل و خوار ہو کر رہ جائے گا۔ اور پھر کوئی چیز نہ ہو گی جو اس کو دوبارہ عزت دے سکے، حتیٰ کہ اعتراف بھی نہیں۔ کیوں کہ اعتراف کی جو کچھ قیمت ہے وہ صرف موجودہ دنیا میں ہے، آخرت میں اعتراف کی کوئی قیمت نہیں۔

تحقیق ضروری ہے

عن عَمرة بنت عبد الرحمٰن انها قالت سمعتُ عائشةَ وذُكِر لها ان عبد الله بن عُمر يقولُ ان الميتَ ليُعذَّبُ ببُكاء الحيّ عليه تقول: يغفرُ اللهُ لابي عبد الرحمٰن اما انه لم يكذب ولكنه نسيَ او اخطأ انما مرّ رسول الله صلى الله عليه وسلم على يهودية يُبكى عليها فقال: انهم ليبكون عليها وانها لتعذّبُ في قبرها۔

(متفق عليه)

عمرہ بنت عبدالرحمٰن بتاتی ہیں کہ عائشہؓ کے سامنے ذکر کیا گیا کہ عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ مُردہ کو زندہ کے رونے پر عذاب دیا جاتا ہے، اس کے بعد میں نے حضرت عائشہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اللہ ابو عبدالرحمٰن کو معاف کرے، وہ جھوٹ نہیں بولے۔ مگر وہ بھول گیے یا ان سے غلطی ہوئی۔ اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک یہودی عورت پر گزرے جس کے مرنے پر لوگ رو رہے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ اس پر رو رہے ہیں، حالاں کہ اس کی قبر میں اس کو عذاب دیا جا رہا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ ان کے تقویٰ اور اخلاص اور حُسنِ نیت میں کوئی شبہ نہیں۔ اس کے باوجود انھوں نے ایک ایسی بات کہی جو اصل واقعہ کے مطابق نہ تھی۔ پھر جب ایک ایسا شخص کسی معاملہ کی صحیح نوعیت کو سمجھنے میں غلطی کر سکتا ہے جو مسلّمہ طور پر مخلص اور متقی ہو تو عام انسانوں کا کیا شمار۔

اس طرح کی مثالیں بتاتی ہیں کہ کسی معاملہ میں رائے دینے کے لیے آدمی کو انتہائی حد تک محتاط ہونا چاہیے۔ اگر وہ رائے دینا ضروری سمجھتا ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس کے تمام ضروری تقاضوں کو پورا کرے۔ وہ نفسیاتی پیچیدگیوں سے اوپر اٹھ کر ہر پہلو سے اس کی پوری تحقیق کرے۔ اور اگر معاملہ نازک ہو تو اس کے بارہ میں دعا اور استخارہ بھی کرے۔ ان ضروری مرحلوں سے گزرے بغیر جو شخص معاملات میں رائے زنی کرے، اس کے متعلق شدید اندیشہ ہے کہ وہ غلطی کر جائے۔ اس کا مخلص اور متقی ہونا غلطی نہ کرنے کی کوئی یقینی ضمانت نہیں۔

رمضان کا مہینہ

بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو باندھ دیا جاتا ہے۔ یہی بات ترمذی اور ابن ماجہ میں اس طرح آئی ہے کہ جب رمضان کے مہینہ کی پہلی رات آتی ہے تو شیطانوں کو قید کر دیا جاتا ہے اور آگ کے دروازوں کو بند کر دیا جاتا ہے، پس اس کا کوئی دروازہ کھلا نہیں رہتا۔ اور جنت کے دروازوں کو کھول دیا جاتا ہے، پس اس کا کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔ اور پکارنے والا پکارتا ہے کہ اے خیر کو چاہنے والے آگے آ، اور اے شر کو چاہنے والے رک جا۔ اور اللہ لوگوں کو آگ سے آزاد کرتا ہے۔ اور ایسا ہی ہر رات کو ہوتا ہے۔

شیطان کا باندھا جانا فرد کی نسبت سے ہے نہ کہ عمومی طور پر تمام لوگوں کی نسبت سے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا بھر کے تمام شیطان ایک مہینہ کے لئے مکمل طور پر باندھ دئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے مہینہ میں شیاطین اس فرد کی نسبت سے بندھ جاتے ہیں جو صحیح معنوں میں روزہ دار ہو۔ جو تمام آداب و شرائط کے ساتھ روزہ کا اہتمام کرے۔ رمضان کے مہینہ میں ایسے روزہ دار شخص کے اوپر شیطان غیر موثر ہو جاتا ہے۔

اس حدیث میں بظاہر "صوم" کی بات کہی گئی ہے، مگر دراصل وہ "صائم" کی بات ہے۔ اس میں اس انسان کا ذکر ہے جو روزہ سے یہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جو، حدیث کے الفاظ میں، روزہ کو اپنے لئے ڈھال بنالے۔

جب رمضان کا مہینہ آتا ہے اور ایک بندۂ مومن اللہ کی خاطر اس کے روزے رکھتا ہے تو اس کو تقویٰ کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس عمل کے دوران اس کے اندر اعلیٰ قسم کی ربانی کیفیات ابھرتی ہیں جو آدمی کو ان فائدوں کا مستحق بنا دیتی ہیں جس کا ذکر حدیث میں کیا گیا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اے ایمان والو، تمہارے اوپر رمضان کا روزہ فرض کیا گیا جس طرح پچھلی امتوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو (البقرہ ۱۸۳)

تقوی دینی حساسیت کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کے اندر دینی احساس کو بیدار کیا جائے۔ اس کو بے حس انسان کے بجائے ایک حساس انسان بنادیا جائے۔ ہر آدمی کی فطرت میں ایک ربّانی انسان موجود ہے۔ روزہ اس لیے ہے کہ وہ آدمی کے اندر چھپے ہوئے اس ربّانی انسان کو جگا دے۔

رمضان کا مہینہ ہر سال اس لیے آتا ہے کہ آدمی کو روزہ کے تجربات سے گذار کر اس کے اندر تعلق باللہ کی کیفیت کو زندہ کیا جائے۔ یہاں تک کہ کوئی بندۂ مومن اپنے رب کو یاد کرکے کہہ اٹھے کہ خدایا، تو شیطان کو اس سے روک دے کہ وہ مجھے گمراہ کرے۔ خدایا، تو میرے لیے جنّت کا دروازہ کھول دے۔ اور اس کا کوئی دروازہ میرے اوپر بند نہ رکھ۔ اور تو میرے اوپر جہنّم کے دروازے بند کردے۔ اور اس کا کوئی دروازہ میرے لیے کھلا نہ رکھ۔ جس شخص کا روزہ اس کے لیے اس پکار میں ڈھل جائے، وہی وہ شخص ہے جس کے حق میں مذکورہ حدیث کے الفاظ پورے ہوں گے۔

روزہ گویا ایک سالانہ موقع ہے جب کہ آدمی شیطان کو باندھ کر اس کو اپنے سے دور کر سکتا ہے۔ حدیث میں بظاہر یہ الفاظ ہیں کہ روزہ کے مہینہ میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کا روزہ اس کے اندر یہ تڑپ پیدا کرے کہ وہ خدا سے اس بات کا طالب بن جائے کہ شیطان کو اس کے اوپر اثرانداز ہونے سے روک دیا جائے، تو خدا اس کو وہی چیز دے دیتا ہے جس کی طلب اس کی نفسیات میں ابھری تھی۔

اسی طرح حدیث میں بظاہر یہ کہا گیا ہے کہ روزہ کے مہینہ میں جنّت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور جہنّم کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا روزہ اس کے اندر یہ احساس بیدار کردے کہ وہ پکار اٹھے کہ خدایا، تو میرے لیے جنّت کے دروازے کھول دے اور جہنّم کے دروازوں کو میرے اوپر بند کردے، تو اس کے لیے خدا اس کا فیصلہ دے دیتا ہے جو اس نے خدا سے اپنے لیے مانگا تھا۔

ہر عمل آدمی کو کسی انعام کا مستحق بناتا ہے۔ روزہ کا عمل آدمی کو اس بات کا مستحق بناتا ہے کہ اللہ اس پر اپنا خصوصی انعام فرمائے، اس کو ہر فتنہ سے محفوظ کرکے اپنی ابدی رحمتوں کے سایہ میں لے لے۔

تشخص کا مسئلہ

مولانا عبدالمتین بنارسی (مقیم دہلی) نے ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ کی ملاقات میں ایک واقعہ بتایا۔ وہ دہلی سے بنارس کے لیے سفر کر رہے تھے۔ ٹرین میں ان کی ملاقات ایک ہندو مسافر سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے مذکورہ ہندو سے پوچھا کہ دسہرہ کیا ہے۔ ہندو نے فوراً جواب دیا: جیسے آپ کے یہاں تعزیہ ہے ویسے ہی ہمارے یہاں دسہرہ ہے۔

ایک اور مسلمان بزرگ نے بتایا کہ انھوں نے ایک ہندو لیڈر کی تقریر سنی۔ لیڈر نے تقریر کے دوران کہا کہ مجھے تو مسلمان اور ہندو کا کوئی فرق نہیں معلوم۔ بس اتنا ہے کہ مسلمان لٹا کر پوجتے ہیں اور ہندو کھڑا کر پوجتے ہیں (یعنی مسلمان قبر کے مردہ کو پوجتے ہیں اور ہندو مندر کی مورتی کو)

ایک بار ایک شہر میں عید میلاد النبی کا جشن تھا۔ روایتی انداز میں لمبا جلوس نکالا گیا۔ ایک ہندو نے اس کو دیکھ کر کہا: آخر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے۔ ہندوؤں کے یہاں اگر رام لیلا ہے تو مسلمانوں کے یہاں محمد لیلا۔

ایک مسجد میں روزانہ فجر کی نماز کے بعد لاؤڈ اسپیکر پر "درود وسلام" پڑھا جاتا تھا، نعت خوانی ہوتی تھی۔ پڑوس کے ایک ہندو نے چند روز اس کو سننے کے بعد کہا: ہندوؤں اور مسلمانوں کا مذہب تو مجھ کو ایک ہی دکھائی دیتا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ ہندوؤں کے یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا نام کیرتن ہے، اور مسلمانوں کے یہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کا نام انھوں نے درود وسلام رکھا ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ موجودہ مسلمانوں نے اپنے دین میں اتنی بدعات اور تحریفات کی ہیں کہ اب دوسرے مذہب والوں کی نظر میں اسلام اور غیر اسلام کا فرق ہی مٹ گیا ہے۔ اسلامی تشخص کا سب سے بڑا مسئلہ بلاشبہ یہی ہے۔ نام نہاد مسلم رہنما شور کرتے ہیں کہ غیر مسلم قومیں ہمارے اسلامی تشخص کو مٹانا چاہتی ہیں۔ مگر اسلامی تشخص کو مٹانے کا جو واقعہ خود مسلمان انجام دے رہے ہیں، اس کے خلاف وہ کچھ نہیں بولتے۔ شاید اس لیے کہ دوسری قوم کے خلاف بولنا سب سے زیادہ آسان کام ہے اور اپنی قوم کے خلاف بولنا سب سے زیادہ مشکل کام۔

دعوت یا نفرت

پرانی دہلی کے ایک محلہ میں ایک شخص نے دکان کھولی۔ اس کے بعد محلہ کا ایک آدمی اس کی دکان پر آنے لگا۔ وہ روزانہ آتا اور دوکان پر بیٹھ کر محلّہ والوں کی برائیاں بیان کرتا۔ دکاندار نے پہلے نرمی کے ساتھ اس کو اس قسم کی باتوں سے روکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ نہ رکا۔ آخر دکاندار ایک روز ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا: میاں صاحب! بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ میری دکان پر نہ آئیں۔ آپ جن لوگوں کی برائیاں کرتے ہیں وہ سب میرے گاہک ہیں۔ آپ کی باتیں سُن کر اگر میرے دل میں ان کی نفرت آجائے تو میں ان کے ساتھ دکانداری نہیں کر سکتا۔ دکانداری پیار کا سودا ہے۔ وہ نفرت اور حقارت کا کاروبار نہیں۔

موجودہ زمانہ میں جو مسلمان اسلام کے مسائل پر لکھنے اور بولنے کے چیمپین بنے ہوئے ہیں، اسلام بھی ان سے بزبانِ خاموش کہہ رہا ہے کہ آپ کا بہت کرم ہوگا، اگر آپ لوگ میرے بارہ میں لکھنے اور بولنے کا موجودہ کام ختم کر دیں۔ کیوں کہ آپ کا سارا کلام منفی کلام ہے، اور یہ منفی کلام میرے تمام دعوتی امکانات کو مسلسل طور پر برباد کر رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے جو لکھنے اور بولنے والے ہیں، وہ سب کے سب اس سادہ حقیقت سے بے خبر نظر آتے ہیں جس کو مذکورہ واقعہ میں ایک معمولی دکاندار نے اول روز جان لیا تھا۔ ہمارے لکھنے اور بولنے والے دعوت کا نام لیتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو داعی کہتے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ ایسی باتیں لکھنے اور بولنے میں مشغول ہیں جو مسلمانوں کے اندر اپنی مدعو قوموں کے خلاف نفرت اور بغض کی فصل اگانے والی ہوں۔

موجودہ مسلم دنیا میں جو لوگ لکھنے اور بولنے کا کام کر رہے ہیں، ان کے کلام کا مشترک خلاصہ ایک لفظ میں شکایت اور احتجاج ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی غیر مسلم فرقہ یا گروہ کی برائیاں بیان کرنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی مغربی مستشرقین کی سیہ کاریوں کا اعلان کر رہا ہے اور کوئی صہیونی یہودیوں کی مکاری کا۔ کوئی استعماری طاقتوں کے ظلم کا انکشاف کر رہا ہے اور کوئی صلیبی قوموں کی معاندانہ کارروائیوں کا۔ کوئی مسیحی مبلّغین کی سازشوں کا انکشاف کر رہا ہے اور کوئی ہندو احیاء پرستوں کے خفیہ منصوبوں کا۔

اسی طرح کوئی مسلم اقلیت کے خلاف غیر مسلم اکثریت کے امتیاز کے اعداد و شمار چھاپ رہا ہے۔ اور کوئی مسلمانوں کے ملی تشخص کو ختم کرنے کے لیے اغیار کی معاندانہ کوششوں پر فریاد کرنے میں مشغول ہے۔ وغیرہ

دعوت کی شریعت میں یہ تمام چیزیں ناجائز کے درجہ میں غلط ہیں۔ یہ تمام لوگ جن کے خلاف موجودہ قلمی اور لسانی جہاد کیا جا رہا ہے، وہ وہی ہیں جن پر ہمیں دعوت کے فرض کو انجام دینا ہے۔ وہ سب کے سب ہمارے لیے مدعو کے درجہ میں ہیں۔ مذکورہ قسم کی تقریریں اور تحریریں مسلسل طور پر مسلمانوں کو اپنے مدعو گروہ سے متنفر کر رہی ہیں۔ اور جن لوگوں کے خلاف آدمی کے دل میں نفرت پیدا ہو جائے، وہ ان کے اوپر دعوت کا عمل جاری نہیں کر سکتا۔

دعوت کا عمل محبت اور خیر خواہی کے سرچشمہ سے نکلنے والا عمل ہے۔ وہ نفرت اور بغض سے بھرے ہوئے سینہ سے ظاہر ہونے والا عمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں داعی کو یک طرفہ طور پر صبر اور اعراض کی روش پر قائم ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ دعوت اور صبر دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ جو لوگ مدعو کی زیادتیوں پر صبر نہ کر سکیں، وہ خدا کے دین کو خدا کے بندوں تک پہونچانے کا کام بھی نہیں کر سکتے۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کے جو لکھنے اور بولنے والے یہ کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی مدعو اقوام کے ظلم اور ان کی سازشوں کے خلاف فریاد کرنے کی ایجنسی لیے ہوئے ہیں، وہ درحقیقت شیطان کے ایجنٹ ہیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ داعی اور مدعو کے درمیان تلخیوں کو خوب بڑھائے تاکہ داعی اپنے مدعو سے اتنا متنفر ہو جائے کہ اس کے دل میں مدعو کے اوپر دعوتی عمل کرنے کا جذبہ ہی باقی نہ رہے۔ یہی وہ کام ہے جو آج ہمارے تمام لکھنے اور بولنے والے انجام دے رہے ہیں۔ یہ بلاشبہ شیطان کے مقصد کی تکمیل ہے نہ کہ خدا کے منصوبہ کو بروئے کار لانے کی جدوجہد۔

فتح اسلام

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہے۔ مکہ کے مخالفین نے مشورہ کیا کہ اپنے اندر کے ایک سمجھ دار شخص کو چنیں تاکہ وہ پیغمبر اسلام کے پاس جا کر ان سے گفتگو کر کے انھیں قائل کر سکے۔ اس مقصد کے لیے ابو الولید عُتبہ بن ربیعہ کا انتخاب کیا گیا جو مکہ کے سرداروں میں سے تھا اور نہایت ذہین اور ہوشیار آدمی سمجھا جاتا تھا۔

عُتبہ نے پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ سے تفصیلی گفتگو کی۔ اس گفتگو کے آخر میں پیغمبر اسلامؐ نے عُتبہ کو قرآن (حم السجدہ) کی ابتدائی آیتیں سنائیں۔

روایات بتاتی ہیں کہ عتبہ اپنا دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا اور حیرت اور خاموشی کے ساتھ قرآن کی آیتیں سنتا رہا۔ اس کے بعد عتبہ سے وہاں سے واپس ہوا تو حسب وعدہ اپنے ساتھیوں کے پاس نہیں گیا، بلکہ اپنے گھر پر بیٹھ گیا۔ ابوجہل کو معلوم ہوا تو اس کو اندیشہ ہوا کہ عتبہ شاید محمدؐ کے کلام سے متاثر ہو گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عتبہ کے گھر گیا۔ اس نے کہا کہ خدا کی قسم اے عتبہ، ہم تمہارے پاس صرف اس لیے آئے ہیں کہ ہم کو اندیشہ ہے کہ تم محمدؐ کی طرف مائل ہو گیے اور محمدؐ کا دین تم کو پسند آگیا (واللّٰہ یا عُتبۃ ما جئنا الاّ انک صبوتَ الیٰ محمّد واعجبک امرہ، صفحہ ۵۰۲)

اس سلسلہ میں کافی تفصیل سیرت کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عتبہ نے کہا کہ خدا کی قسم، اس آدمی کی زبان سے میں نے ایسا کلام سنا جیسا کلام میرے کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کو سن کر میں اتنا مسحور ہو گیا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کا کیا جواب دوں (واللّٰہ لقد سمعتُ من ھذا الرّجل کلاماً ما سَمِعتْ اذنای کلاماً مثلہ وما دریتُ ما اَرُدُّ علیہ، صفحہ ۵۰۵) سیرۃ ابن کثیر، المجلد الاوّل۔

اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں مسلسل ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں جب کہ ایک شخص کسی دوسرے مقصد کے تحت اسلام سے قریب ہوا۔ مگر جب اس نے اسلام کی تعلیمات کو جانا تو اس کے دل نے اس کی سچائی پر گواہی دی، اور اس نے خود اپنے جذبہ کے تحت اسلام

قبول کرلیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ چنانچہ جب کوئی شخص اسلام سے قریب ہوتا ہے تو وہ عین اپنی اندرونی فطرت کے زور پر اسلام کی طرف کھنچ اٹھتا ہے اور اس کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔

ایسے واقعات ماضی میں بھی کثرت سے پیش آئے، اور حال میں بھی کثرت سے پیش آرہے ہیں۔ الرسالہ دسمبر ۱۹۷۶ میں اسی قسم کا ایک واقعہ جاپان سے متعلق شائع کیا گیا تھا۔

مسٹر سبورو ایک جاپانی پروفیسر تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ جاپانی انسائیکلو پیڈیا کے لیے اسلام پر ایک آرٹیکل تیار کریں۔ اس مقصد کے تحت انھوں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا۔ مطالعہ کے دوران ان پر اسلام کی سچائی روشن ہوتی چلی گئی۔ ان کے دل نے گواہی دی کہ یہی انسانیت کا حقیقی مذہب ہے۔ یہاں تک کہ جب ان کا آرٹیکل تیار ہوا تو وہ خود بھی اسلام قبول کر کے عملاً اسلام کے دائرہ میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۰ کا ہے (صفحہ ۳۴)

اس سلسلہ کی ایک تازہ مثال وہ ہے جو مکہ کے عربی ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی (۲۹ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ، ۲۷ نومبر ۱۹۸۹ء) میں شائع ہوئی ہے۔ یہ ایک تفصیلی رپورٹ ہے جس کا عنوان ہے:

فشل المخطط الكنسي لأفرقة التنصير

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی تنظیموں نے اعلیٰ تربیت کے ذریعہ ۵۳۶۴ مبلغین تیار کیے اور ان کو افریقی ملک لیبیریا کی راجدھانی منروویا (Monrovia) بھیج دیا۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ خاموش تبلیغ کے ذریعہ لیبیریا (Liberia) کے دس لاکھ مسلمانوں کو مسیحی مذہب میں داخل کر دیں۔

یہ مسیحی مبلغین تمام علمی اور مادی ذرائع سے پوری طرح مسلح تھے۔ ان کو اتنا زیادہ تیار کیا گیا تھا کہ وہ لیبیری قبائل کی مقامی زبانیں، مانکا، بانیکا، منیکا، کیسکا، بلیسکا، نہایت روانی کے ساتھ بولتے تھے۔

ان تمام تیاریوں کے باوجود نتیجہ الٹا ہوا۔ ان مسیحی مبلغین کی بیشتر تعداد نے وہاں پہونچ کر اسلام قبول کر لیا۔ جس ملک میں وہ مسیحیت کی تبلیغ کے لیے بھیجے گئے تھے، وہاں اب وہ

اسلام کی تبلیغ کرنے میں مشغول ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ تربیت کے دوران انھیں مختلف مذہبوں کا مطالعہ کرایا گیا تھا، مگر اس نظام کے تحت انھیں اسلام کی صرف مسخ شدہ تعلیمات ہی سے واقف کرایا گیا لیبیریا میں جب ان کا سابقہ مسلمانوں سے ہوا تو انھیں موقع ملا کہ وہ اسلام کو زیادہ صحیح صورت میں جان سکیں۔ اس واقفیت کے بعد ان کی آنکھ کھل گئی۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ عیسائی تنظیموں نے اس مقصد کے لیے افریقی نسل کے مسیحیوں کا انتخاب کیا تھا تاکہ وہ لیبیریا پہونچیں تو وہ وہاں کے لوگوں کو اجنبی نہ دکھائی دیں۔ ان کو بتایا گیا کہ وہ ملک کی قبائلی زبانوں میں مہارت حاصل کریں اور وہاں کے سماج میں گھل مل کر خاموشی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ چنانچہ یہ لوگ مسلم آبادیوں کے درمیان غیر محسوس طریقہ پر آباد ہو گئے۔ ان میں بہت سے لوگوں نے لیبیریا کی نیشنلٹی کا سرٹیفکٹ بھی حاصل کر لیا۔ اسی خاص انداز کار کی وجہ سے اس منصوبہ کا نام اَفْرَقَۃُ التَّنْصِیْر رکھا گیا تھا۔

لیبیریا کی مسلم تنظیموں کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو انھوں نے شور وغل کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ جوابی تبلیغی عمل شروع کر دیا۔ مثلاً انھوں نے ملک کے مختلف شہروں —— فوسنجاما، کاکاتا، سنکولی، کاتیلا وغیرہ میں اجتماعات شروع کیے اور آل مذاہب کانفرنسیں منعقد کیں۔ ان میں لوگوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ہر مذہب کے بارہ میں کھل کر بحث ومذاکرہ کریں۔ ان کانفرنسوں میں مسیحی علمار کو سخت ناکامی ہوئی۔ مسلم علماء کے مقابلہ میں وہ نہ علمی سطح پر اپنا دفاع کر سکے اور نہ دلائل کے ذریعہ اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

دوسری طرف ان کانفرنسوں کے ذریعہ یہ ہوا کہ اسلام کی سچائی اور برتری نمایاں ہو کر سامنے آگئی۔ اس سے ان مسیحی مبلغین میں مایوسی اور ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اپنے موجودہ مشغلہ کو اپنی فطرت کی آواز کے خلاف سمجھا۔ وہ عیسائیت کے بجائے اسلام کی مزید تحقیق میں لگ گئے۔ یہاں تک کہ ان کی اکثریت نے قبول اسلام کا اعلان کر دیا۔ جو لوگ مسیحی مبلغ بن کر آئے تھے، وہ اسلام کے مبلغ اور اس کے علم بردار بن گئے۔

جس اسلام کی طاقت اتنی زیادہ ہو، اس کے ماننے والے اگر یہ نعرہ لگائیں کہ اسلام خطرہ میں ہے (Islam is in danger) تو ایسے لوگوں سے زیادہ نادان قوم اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

عمل، ردّ عمل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے تلاش حق میں بے چین رہتے تھے۔ یہاں تک کہ غار حرا میں خدا کا فرشتہ ظاہر ہوا، اس نے خدا کی طرف سے یہ حکم سنایا کہ اِقرأ (پڑھ) کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے "قلم" کے ذریعہ انسانوں کی رہنمائی کا سامان کیا ہے (علّم بالقلم علم الانسان مالم یعلم)

یہ واقعہ جو اپنی مخصوص صورت میں پیغمبرانہ سطح پر پیش آیا، یہی دوسروں سے بھی غیر پیغمبرانہ سطح پر مطلوب ہے۔ آج بھی ضرورت ہے کہ کوئی بندۂ خدا حق وصداقت کی جستجو میں بے چین ہو۔ اور پھر اس کو غیبی آواز پکار کر کہے کہ "پڑھ"۔ وہ اس پکار کی اتباع میں قرآن اور حدیث اور سیرت اور صحابہ کی زندگیوں کا گہرا مطالعہ کرے۔ اس مطالعہ کے بعد اس پر کھلے کہ امر حق کیا ہے۔ وہ اس کو لے اور اس کی روشنی میں لوگوں کو رہنمائی دینا شروع کرے۔

مگر موجودہ زمانہ میں جو مفکر اور رہنما اٹھے، ان میں سے کوئی بھی نہیں جو ان مراحل سے گزرا ہو۔ ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ مسلم سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہونے والے حالات کو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ اور مسلمانوں کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی مغلوبیت ختم کرنے کے لیے "جہاد" کرنے لگا۔

اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ردعمل تھا نہ کہ عمل۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اٹھنے والے مفکرین اور رہنماؤں میں سے کوئی نہیں جو اسلام کی صحیح تشریح کرنے میں کامیاب ہوا ہو۔ ان کی ردعمل کی نفسیات نے انھیں اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کی طرف مائل کر دیا۔ جس کو وہ غلطی سے جہاد کہتے رہے۔

یہ مفکرین اگر مذکورہ پیغمبرانہ انداز میں اٹھتے تو ان کے اندر داعیانہ فکر ابھرتا، جیسا کہ پیغمبر کے اندر "حرا" کے تجربہ کے بعد ابھرا۔ مگر ان کی ردعمل کی نفسیات کی بنا پر ان کے اندر صرف مہاجمانہ (لڑائی بھڑائی) کا ذہن ابھر آیا۔ ان رہنماؤں کی پرشور تحریکیں ملت کو کوئی مثبت فائدہ نہ پہونچا سکیں۔ البتہ ان کا نقصان یہ ہوا کہ پوری ملت کا ذہن خراب ہو گیا۔ مسلمان داعیانہ طرز فکر سے خالی ہو کر جنگ جویانہ طرز فکر پر قائم ہو گئے۔

موجودہ ملت مسلمہ کا بلاشبہ یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

صرف ہندستان نہیں

ڈاکٹر رفیق زکریا کی ایک انگریزی کتاب ۱۹۸۸ میں نئی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا نام ہے داخلی کش مکش اسلام میں (The Struggle within Islam) مصنف نے اس کتاب میں جو باتیں لکھی ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جس کا تعلق ہندستانی مسلمانوں سے ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اچھا ہوگا اگر وہ یہاں دھیما انداز اختیار کریں، کیوں کہ پُرشور انداز والا اسلام ہندستان میں صرف ٹکراؤ پیدا کرنے کا باعث ہوگا:

It would be better if the community kept a low-profile because high-profile Islam in India can only provoke confrontation.

مسٹر جی حبیب اللہ نے اس نظریہ پر تنقید کی ہے جو ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جون ۱۹۸۹) میں شائع ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام، دوسرے مذہبوں کی طرح نرمی اور مصالحت کو گوارا نہیں کر سکتا۔ مسیح کے متعلق بے ہودہ اور کافرانہ فلم لاسٹ ٹمپٹیشن آف کرائسٹ پر عیسائیوں کے نرم ردعمل کا مقابلہ سیٹنگ ورسسز پر مسلمانوں کے شدید ردّعمل سے کیجیے۔ اسلام ایسا نہیں کر سکتا کہ بس اپنا سر نیچا کر لے اور مصلحت اندیشانہ اور شریفانہ انداز اختیار کرے:

Compare the bland Christian reaction to the vulgar and blasphemous film, The Last Temptation of Christ, and the vigorous Muslim reaction to The Satanic Verses. Islam is just not going to keep its head down and behave in a prudently gentlemanly fashion.

"لو پروفائل" اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک اصول ہے نہ کہ سرافگندگی۔ خواہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، ہر جگہ اسی طریقہ پر چل کر کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ لو پروفائل کے مسلک پر پرجوش لفظی تنقید کرتے ہیں، وہ خود بھی اپنے ذاتی معاملات کو ہمیشہ اسی ڈھنگ پر درست کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو لو پروفائل کا طریقہ بطور اصول اختیار کرنا چاہیے، نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں۔ موجودہ زمانہ میں اس کے سوا زندگی کا کوئی اور طریقہ نہیں۔

ردِّ عمل کے تحت

مشہور اخبار زمیندار کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خاں (۱۹۵۶ - ۱۸۷۳) سیالکوٹ میں پیدا ہوئے اور اپنے وطن کرم آباد (پنجاب) میں انتقال کیا۔ نوائے وقت (۲۷ نومبر ۱۹۸۹) میں ان کی بابت مفصل معلومات شائع ہوئی ہیں۔ ایک اقتباس یہ ہے :

"ظفر علی خاں کے والد مولانا سراج الدین کشمیر کے محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے۔ اوائل عمر میں مولانا ظفر علی خاں کو کشمیر میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی قومی غیرت کو تڑپا دیا۔ مولانا ظفر علی خاں کے سوانح نگار محمد اشرف خاں عطا لکھتے ہیں کہ میٹرک پاس کر لینے کے بعد مولانا ظفر علی خاں اپنے والد سے ملنے گلمرگ (کشمیر) گیے۔ وہاں ایک دن وہ ڈاک خانہ کے باہر بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں ایک انگریز فوجی افسر گھوڑے پر وہاں آگیا۔ اس نے بڑی تمکنت سے ظفر علی خاں کو بلایا اور کہا کہ اے لڑکے، جب تک میں اندر سے واپس نہیں آتا، تم میرے گھوڑے کی لگام پکڑے یہاں کھڑے رہو۔ نوجوان ظفر علی خاں کو اس فرنگی کی بات سخت ناگوار گزری۔ انھوں نے اس کو دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ اس کو سن کر انگریز سکتہ میں آگیا۔ اس نے اس گستاخی کی شکایت حکام بالا سے کر دی۔ نتیجۃً ظفر علی خاں کو اپنے والد کے کہنے پر واپس پنجاب آنا پڑا۔ یہ بات عمر کے ساتھ ساتھ شعوری طور پر مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کر گئی"

اخبار مذکور نے لکھا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کا شمار فرنگی حکومت کے صف اول کے مخالفوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے دنیائے اسلام کی ہر اس تحریک میں حصہ لیا جو کسی بھی ملک میں کسی بھی قیادت کے تحت انگریزوں کے خلاف اٹھی۔ مثلاً تحریک خلافت، تحریک مسجد کانپور، تحریک آزادی ہند، وغیرہ۔ اخبار کے الفاظ ہیں : "ان کی نظروں کے سامنے سلطنت عثمانیہ کا سقوط ہوا۔ خود ان کا خمیر مغلیہ سلطنت کے عظیم کھنڈروں کی راکھ سے اٹھا جس میں امت مرحومہ کی چنگاری ابھی سلگ رہی تھی۔ انھوں نے نیل کے ساحل سے لیکر کاشغر کی حدوں تک پھیلی ہوئی مسلم سلطنت کو پارہ پارہ ہوتے دیکھا۔ ان کے سامنے ہی شیراز کا بلبل بغداد کی تباہی پر نالہ کش ہوا۔ اور داغ دہلی کی بربادی پر رویا اور ابن بدرون غرناطہ کے زوال پر نوحہ کناں ہوا"

ان حادثات (صحیح تر لفظ میں، مسلمانوں کی غفلت سے پیش آنے والے واقعات) نے مولانا ظفر علی خاں کو تڑپا دیا۔ وہ اپنی تڑپ کو نظم و نثر میں انڈیلتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ کو اس دنیا سے چلے گیے۔

مولانا ظفر علی خاں یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کی یہ منفی چیخ پکار مثبت نتیجہ پیدا کرے گی۔ انھوں نے پرجوش طور پر کہا تھا :

عنقریب اسلام کی فصل بہار آنے کو ہے

مگر یہ سراسر خوش خیالی تھی جو کبھی پوری نہیں ہوئی۔ یہ ایک مولانا ظفر علی خاں کی بات نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام رہنماؤں کا حال ہے۔ وہ اپنی منفی کاشت سے مثبت فصل کی امید کرتے رہے۔ وہ دوسروں کی تخریب میں اپنی تعمیر کا خواب دیکھتے رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی اسی جوش کے ساتھ جاری ہے۔ مگر یہ یقینی ہے کہ اس قسم کی کوششوں سے نہ ماضی کے لیڈر کوئی نتیجہ برآمد کر سکتے تھے اور نہ حال کے لیڈر کوئی نتیجہ برآمد کر سکیں گے۔ اس قسم کی تمام سرگرمیاں ضیاع وقت کے خانہ میں جانے والی ہیں نہ کہ تعمیر قوم کے خانہ میں۔

اصول، مفاد

موجودہ بائبل اگرچہ محرّف ہو چکی ہے، تاہم اس میں بہت سے اجزاء ایسے ہیں جو نہایت عبرت ناک ہیں۔ بائبل اپنی موجودہ شکل میں سابق اہل کتاب (یہود) کی تاریخ بھی ہے اور ان کے نبیوں کے فرمودات کا مجموعہ بھی۔ اس میں بار بار بتایا گیا ہے کہ اگر تم خدا کی شریعت پر چلو اور خدا کے حکموں کو مانو تو تمھیں ہر قسم کی کامیابی حاصل ہوگی۔ اور اگر تم خدا کے حکموں کو نہ مانو اور اس کے خلاف چلنے لگو تو خدا تم کو حقیر کر کے تم کو تمہارے دشمنوں کے حوالے کر دے گا (مثال کے طور پر، احبار، باب ۲۶)

بعد کے زمانہ میں جب یہود کے اندر بگاڑ آیا تو خدا نے اپنے نبیوں کے ذریعہ مسلسل انھیں انتباہ دیا۔ اس کی تفصیلات بائبل کے کئی ابواب میں پھیلی ہوئی ہیں (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، یرمیاہ کی کتاب) اس سلسلہ میں چیتاونی دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس کے بعد وہ مردود چاندی کہلائیں گے۔ کیوں کہ خداوند نے ان کو رد کر دیا ہے (یرمیاہ، ۶ : ۳۰) :

Reprobate silver shall men call them,
because the Lord hath rejected them.

یہود کے بارے میں یہ بات بحیثیت نسل نہیں کہی گئی ہے بلکہ بحیثیت اہل کتاب کہی گئی ہے۔ یہ ان قوموں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جن کو الہامی کتاب بھیجی جائے، جن کے درمیان پیغمبر خدا کی ہدایت لے کر آئیں۔ ایسی قوم جب خدا کی بتائی ہوئی روش سے ہٹ جائے تو خدا بھی اسے رد کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان ایسے ہو جاتے ہیں جیسے مردود چاندی یا ایسا سکہ جس کو بینک نے رد کر دیا ہو۔

اس سلسلہ میں بائبل میں (نیز قرآن و حدیث میں) جو بیانات ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کے دو طریقے ہیں۔ ایک ہے، خدا کی پسند پر جینا۔ اور دوسرا ہے، اپنی پسند پر جینا۔ دوسرے لفظوں میں اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہے، اصولِ حق کے لیے جینا، اور دوسرا ہے، ذاتی مفاد کے لیے جینا۔

جب لوگوں کا حال یہ ہو کہ ان کی تمام سوچ اور ان کے تمام جذبات خدا کی طرف متوجہ ہوں، وہ خدائی ہدایات کو اولیت دیتے ہوں۔ وہ زندگی کے ہر معاملہ میں ربانی مقاصد کو اونچا رکھیں، تو ایسے لوگ خدا کی نظر میں محبوب اور معزز ہو جاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں وہ بندوں کی نظر میں بھی محبوب اور معزز قرار پاتے ہیں۔

اس کے برعکس جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ خدا کو بھولے ہوئے ہوں، وہ خود ساختہ شریعت پر چلیں۔ ان کے ذاتی مفادات ہی ان کی زندگی کا مرکز و محور بن جائیں، تو خدا ایسے لوگوں کی طرف سے اپنی نظریں ہٹا لیتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی قوم لوگوں کے درمیان حقیر اور مغلوب ہو کر رہ جاتی ہے۔

عروج وزوال کا یہی قانون سابق اہل کتاب (یہود) کے لیے تھا۔ اور عروج وزوال کا یہی اٹل قانون موجودہ اہل کتاب (مسلمانوں) کے لیے بھی ہے۔ یہود کی قیمت اللہ کی نظر میں ان کے عمل کے اعتبار سے تھی، اسی طرح مسلمانوں کی قیمت بھی اللہ کی نظر میں ان کے حقیقی عمل کے اعتبار سے قرار پائے گی نہ کہ کسی اور اعتبار سے۔

اگر مسلمانوں کا حال یہ ہو جائے کہ ان کے رہنما ذاتی عزت و شہرت (self-glory) کے لیے کام کریں۔ ان کے دولت مند اپنی دولت کو صرف ذاتی حوصلوں کی تکمیل میں لگائیں۔ ان کا دانشور طبقہ اپنی زبان و قلم کو بازار کا سودا بنا لے۔ ان کے خواص ان چیزوں کی طرف دوڑیں جن میں اخباری اہمیت (news value) ہوتی ہے۔ ان کے عوام خود ساختہ رسموں کو اپنا لیں، ان کی اخلاقی حس اتنی کند ہو جائے کہ کوئی شخص عدل کو عدل اور ظلم کو ظلم کہنے والا باقی نہ رہے۔ جب ایسا ہو جائے تو مسلمانوں کے حق میں بھی اسی قانون خداوندی کے نفاذ کا انتظار کرنا چاہیے جو سابق اہل کتاب (یہود) پر نافذ ہوا۔ موجودہ گروہ بھی اسی طرح رد کر دیا جائے جس طرح پچھلا گروہ رد کیا گیا۔

خدا کے یہاں ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ خدائی قانون کے نفاذ میں کسی گروہ کا کوئی استثنار نہیں۔ وہ دوسرے گروہ کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرے گا جو اس نے پہلے گروہ کے ساتھ کیا۔ اس معاملہ میں اگر کسی کو خوش فہمی ہو تو اس کو قرآن کی

یہ آیت پڑھنی چاہیے :

لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءا یجز بہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرا (النساء ۱۲۳)	نہ تمہاری آرزوؤں پر ہے اور نہ اہل کتاب (یہود) کی آرزوؤں پر ہے ۔ جو شخص بھی برا عمل کرے گا اس کو ضرور اس کا بدلہ دیا جائے گا ۔ اور وہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حمایتی اور مددگار نہ پائے گا ۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے جو نوٹ لکھا ہے وہ نہایت بامعنی ہے ۔ اس نوٹ کو یہاں نقل کیا جاتا ہے :

"کتاب والوں ، یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کو خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں ۔ جن گناہوں پر خلقت پکڑی جائے گی ، ہم نہ پکڑے جائیں گے ۔ ہمارے پیغمبر حمایت کر کے ہم کو بچالیں گے ۔ اور نادان اہل اسلام بھی اپنے حق میں یہی خیال کر لیا کرتے ہیں ۔ سو فرمادیا کہ نجات اور ثواب کسی کی امید اور خیال پہ موقوف اور منحصر نہیں ۔ جو برا کرے گا ، پکڑا جائے گا ۔ کوئی ہو ، اللہ کے عذاب کے وقت کسی کی حمایت کام نہیں آسکتی ۔ اللہ جس کو پکڑے ، وہی چھوڑے تو چھوٹے ۔ اور جو کوئی عمل نیک کرے گا ، بشرطیکہ ایمان بھی رکھتا ہو ، سو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے ، اور اپنی نیکیوں کا پورا ثواب پائیں گے ۔ خلاصہ یہ کہ ثواب وعقاب کا تعلق اعمال سے ہے ، کسی کی امید اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا ۔ سو ان امیدوں پر لات مارو اور نیک کاموں میں ہمت کرو ۔" (صفحہ ۱۲۶)

دعوتی تسخیر

حال میں فرانس کے ایک مشہور آرٹسٹ نے اسلام قبول کر لیا ہے ۔ اس کا سابقہ نام برنارڈ جو ہے ۔ اور موجودہ اسلامی نام عبدالعزیز ہے ۔ انھوں نے بتایا کہ مجھے اپنے فن سے عشق تھا اور اس کے لیے میں دنیا کے مختلف ملکوں میں کثرت سے سفر کرتا تھا ۔ اس سلسلہ میں میں مصر گیا اور قاہرہ اور اسکندریہ میں چند روز قیام کیا ۔

ایک روز جب کہ میں قاہرہ کی سڑکوں پر چل رہا تھا ، میرے کان میں ایک پرکشش آواز آئی ۔ یہ اذان کی آواز تھی جو مسجد کے میناروں سے بلند ہو رہی تھی ۔ اس قسم کی آواز میں نے پہلی بار سنی تھی ۔ مجھے مزید جستجو ہوئی ۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ نماز کی پکار ہے تو میں مسجد میں گیا اور لوگوں کو صف بستہ نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ۔ اذان کی آواز اور نماز کے مناظر نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ۔ میں فرانس واپس آیا تو میں نے اسلامی لٹریچر تلاش کر کے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا ۔ میں نے قرآن کی تلاوت کے کیسٹ بھی سنے ۔ ان عربی کیسٹوں کو اگرچہ میں سمجھتا نہ تھا ، مگر ان کا سننا مجھے اچھا لگتا تھا ، اس لیے میں ان کو سنتا رہا ۔

اس کے بعد میں دوبارہ مصر گیا ۔ وہاں میں نے الازہر کے علماء کے سامنے اسلام قبول کر لیا ۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ سابق "برنارڈ جو" اور موجودہ "عبدالعزیز" میں بہت زیادہ فرق ہے ۔ اسلامی عقیدہ نے میرے طریقہ کو بدل دیا ہے ۔ تاریکی کے بعد اب میں روشنی میں آگیا ہوں ۔ مجھے اپنے اندر ایک ایسا سکون محسوس ہو رہا ہے جس سے میں اس سے پہلے کبھی آشنا نہ تھا ۔ اسلام میری روح اور میرے جسم میں خون کی طرح رواں دواں ہے (صفحہ ۶)

یہ کوئی ایک مثال نہیں ۔ فرانس میں (اور اسی طرح دوسرے مغربی ملکوں میں) کثرت سے لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ۔ خود فرانس میں پچھلے سالوں میں روجیہ جارودی ، مائیکل شودکیوبنز اور موریس بجار وغیرہ جیسے بہت سے مشہور اور ممتاز لوگ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اور برابر داخل ہو رہے ہیں ۔ ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے ریاض کے ہفت روزہ الدعوۃ (۲ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ ، ۳۰ نومبر ۱۹۸۹ء) نے لکھا ہے :

رغم كل محاولات الحاقدين من مستشرقين أو غيرهم والذين يحاولون النيل من الاسلام وتشويه صورته إلا انه ينتشر كالبلسم الشافي لجروح الانسان على الارض. فلا الحروب الصليبية كسرت شوكته ولا المستشرقين نالوا منه ولا الآيات الشيطانية حدت من دخول الناس في دين الله افواجًا۔

اگرچہ مستشرقین اور دوسرے مخالفین اسلام کو بدنام کرنے اور اس کی تصویر بگاڑنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اس کے باوجود اسلام انسانوں کے زخموں کے لیے ایک شفا بخش مرہم کی طرح دنیا میں پھیل رہا ہے۔ صلیبی لڑائیاں اس کی عظمت کو توڑ نہ سکیں اور نہ مستشرقین کی تحریریں یا "آیات شیطانی" جیسی کتابیں لوگوں کو دینِ خدا میں فوج در فوج داخل ہونے سے روکنے والی ثابت ہوئیں۔

یہ واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ مخالفین کی مخالفتوں سے گھبرانے یا ان پر شور و غل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ اسلام کی اپنی تسخیری طاقت پر اعتماد رکھیں، وہ دوسروں کی مخالفانہ کارروائیوں کو کوئی اہمیت نہ دیں۔

تاریخ نے بار بار یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام خود اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ اس کی یہ طاقت نہ سیاست کے خاتمہ سے فنا ہوتی اور نہ دوسروں کی سازشوں سے۔ اسلام ہر حال میں خود اپنی فکری اور نظریاتی طاقت کے بل پر پھیلتا ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کا اخلاقی یا قومی زوال بھی اس کے اشاعتی عمل کو روکنے والا نہیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کے زمانہ میں اسلام نے انتہائی تیزی کے ساتھ لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے بگاڑ کے زمانہ میں بھی اپنی پیش قدمی برابر جاری رکھی ہے۔ ایسی حالت میں مایوسی یا فریاد کی کیا ضرورت۔

اسلامی نکاح

نکاح عورت اور مرد کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ یہ معاہدہ مقدس بھی ہے اور مستقل بھی۔ اس موقع پر مرد کی طرف سے عورت کو جو مہر دی جاتی ہے، وہ معاوضہ یا ہدیہ نہیں ہے۔ وہ در اصل ایک علامتی رقم (token money) ہے۔ مہر کی صورت میں مرد ایک علامتی رقم ادا کرکے اس بات کا سنجیدہ عہد کرتا ہے کہ وہ نکاح کی تمام شرعی اور انسانی ذمہ داریوں کو نبھائے گا۔ شریعت کے مطابق مہر کی مقدار ایسی ہونی چاہیے جس کا ادا کرنا آسان ہو۔ (خیر الصداق ایسرہ)

مہر کی ذمہ داری مرد پر ڈالنے کی وجہ یہ ہے کہ مرد صنف قوی ہے۔ عورت کا صنفِ ضعیف ہونا بذاتِ خود اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ معاہدہ کی پابند رہے گی۔ اس لیے مہر کی ذمہ داری مرد (صنفِ قوی) پر ڈالی گئی، تاکہ اس کو اس کی خصوصی ذمہ داری یاد دلائی جائے۔

حضرت انس بن مالک مشہور صحابی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ نے جب نکاح کیا تو اس نے آدھے دین پر عمل کر لیا۔ پس اس کو چاہیے کہ وہ بقیہ آدھے دین میں اللہ سے ڈرے (اذا تزوّج العبدُ فقد استکملَ نصف الدینِ فلیتّقِ اللّٰہ فی النصف الباقی) مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۹۳۰

اس حدیث کی روشنی میں جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان نکاح اور ازدواجی زندگی کے معاملہ میں صرف آدھے دین کی حد تک دین دار ہیں۔ بقیہ آدھے دین کے معاملہ میں وہ خدا سے بے خوفی کی حد تک بے دین بنے ہوئے ہیں۔ ان غیر دینی طریقوں میں سے ایک، قابلِ نفرت حد تک قبیح چیز وہ مسرفانہ رسوم ہیں جو شادی کے موقع پر رواجاً ضروری بن گئی ہیں۔ ان جھوٹی رسموں نے موجودہ زمانہ میں بے شمار خاندانوں کو ایک قسم کے سماجی عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔

مسرفانہ تقریبات

نکاح کے ارکان وشروط کے بارہ میں فقہاء کے درمیان کچھ لفظی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ تاہم اس سے قطع نظر، اصل یہ ہے کہ اسلامی نکاح صرف طرفین کے ایجاب وقبول سے واقع ہو جاتا ہے، بشرطیکہ اس کا اعلان بھی کیا گیا ہو، اور ناکح نے منکوحہ کو اس کی ضروری مہر ادا کر دی

ہو۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام میں نکاح اور شادی کا معاملہ کتنا زیادہ سادہ اور سہل ہے۔

مگر موجودہ زمانہ میں مسلم شادیوں میں ایسے برے رواج شامل ہو گیے ہیں جنھوں نے ایک جائز فعل کو ناجائز فعل میں تبدیل کر دیا ہے۔ ایک یہ کہ شادی کو خاندانی وقار کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں نکاح کی سادہ اسلامی تقریب مصنوعی دھوم اور بے جا نمائش کی تقریب بن گئی ہے۔ اس دھوم اور نمائش کو قائم رکھنے کے لیے لوگ مالی اعتبار سے لُٹ جاتے ہیں۔ جائدادیں بیچ دیتے ہیں۔ اور سودی قرض کی لعنت میں پھنس جاتے ہیں۔ ایک دن کی ظاہری دھوم کی خاطر وہ اپنی پوری زندگی کو بے دھوم بنا لیتے ہیں۔

یہ تمام چیزیں سراسر غیر اسلامی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نکاح کی تقریب کو انتہائی حد تک سادہ اور بے خرچ ہونا چاہیے۔ وہ ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے نماز کا وقت آیا اور آدمی نے مسجد میں جاکر نماز پڑھ لیا۔ نکاح اور شادی کو ایک سنجیدہ فریضہ کی ادائگی کا دن ہونا چاہیے، نہ کہ شخصی حیثیت یا خاندانی عزت کے اظہار کا دن۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اعظمَ النکاحِ برکةً ایسرُہُ مُؤنَةً — بے شک سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جو سب سے زیادہ ہلکا اور کم خرچ ہو۔

(مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۹۲۰)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخصوص مصالح کی بنا پر کئی نکاح کی اجازت تھی۔ چنانچہ آپ نے مختلف اوقات میں گیارہ خواتین سے نکاح کیا۔ نو خواتین بوقت وفات آپ کے یہاں موجود تھیں۔ ان میں سے کسی بھی نکاح کے موقع پر کسی بھی قسم کی کوئی نمائشی تقریب نہیں کی گئی۔

مثلاً آپ کی ایک اہلیہ سودہ بنت زمعہ تھیں۔ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد مکہ میں ان کے ساتھ آپ کا نکاح ہوا۔ سودہ ایک بیوہ خاتون تھیں۔ آپ کی طرف سے خولہ بنت حکیم نکاح کا پیغام لے کر گئیں۔ انھوں نے پہلے سودہ سے اس کا ذکر کیا۔ سودہ نے کہا کہ اگر میرا باپ راضی ہو تو مجھے کوئی عذر نہیں۔ چنانچہ خولہ نے سودہ کے باپ سے گفتگو کی۔ انھوں نے اس رشتہ سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد آپ سودہ بنت زمعہ کے مکان پر گیے اور وہاں سادہ طور پر نکاح پڑھا دیا گیا۔

اصحاب رسول کا طریقہ بھی ہمیشہ یہی رہا۔ حتیٰ کہ صحابہ میں جو لوگ صاحب مال تھے، انھوں نے

بھی ہمیشہ سادہ اور بے خرچ انداز میں نکاح کیا۔ مثال کے طور پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایک تاجر تھے۔ وہ ان چند صحابہ میں تھے جو مالدار شمار کیے جاتے تھے۔ انھوں نے مدینہ میں ایک خاتون سے نکاح کیا۔

امام احمد نے حضرت انس کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی مواخاۃ مدینہ میں ایک ایسے مسلمان کے ساتھ کی گئی جو بہت مالدار تھے۔ انھوں نے اپنے نصف مال کی پیش کش کی۔ مگر عبدالرحمٰن بن عوف نے ان کے مال میں سے کچھ نہیں لیا۔ انھوں نے مدینہ میں تجارت شروع کر دی۔ یہاں تک کہ وہ خود ایک مال دار شخص ہو گیے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ایک روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے تو ان کے کپڑے پر خوشبو کا اثر تھا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یمانی زبان میں فرمایا مَھْیَم۔ یعنی کیا بات ہے۔ انھوں نے کہا: یارسولَ اللہ تزوجتُ امرأۃ (اے خدا کے رسول، میں نے ایک عورت سے نکاح کر لیا ہے) الجزء الاول، ۳۸۰

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اگر چہ مدینہ میں تھے۔ مگر انھوں نے اپنے نکاح میں دھوم والی کوئی تقریب نہیں کی۔ حتی کہ رسول اللہؐ کو اور آپ کے قریبی اصحاب کو بھی شادی کی تقریب میں مدعو نہیں کیا۔ سادہ طور پر محض ایجاب و قبول کے ذریعہ نکاح کر لیا۔ اور مقررہ مہر ادا کر کے ازدواجی زندگی گزارنے لگے۔

تلک کی رسم

مسلمانوں میں آج کل جہیز کی جو رسم ہے، وہ عین اسی ہندوانہ رسم کی نقل ہے جو برادران وطن کے درمیان تلک (dowry) کے نام سے رائج ہے۔ ہندوؤں میں یہ رسم غالباً زرعی دور میں اس طرح پڑی کہ ان کے مذہبی قانون کے مطابق، جائداد میں لڑکیوں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اس کی جزئی تلافی کے لیے شادی کے موقع پر کچھ نقد یا سامان لڑکی کو دینے کا رواج شروع ہوا۔

غیر قوموں کی جن چیزوں کو مسلمانوں نے باقاعدہ اپنا لیا ہے، ان پر تو وہ دین کی طرح عمل کرتے ہیں۔ لیکن غیر قومیں اگر خود کسی چیز کو ان کے درمیان رائج کرنا چاہیں تو فوراً ان کے تمام اصاغر و اکابر پکار اٹھتے ہیں کہ ان کی ملی شناخت کو مٹانے کی سازش کی جارہی ہے۔

جہیز کی رسم

مسلمانوں میں آجکل جہیز کی جو رسم ہے، وہ عین اسی ہندوانہ رسم کی نقل ہے جو برادرانِ وطن کے درمیان تلک کے نام سے رائج ہے۔ پہلے جہیز کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی کا سرپرست لڑکی کو نیا گھر بسانے کے لیے ضروری سامان دیدے۔ مگر اس نے باقاعدہ مطالبہ اور خرید و فروخت کی صورت اختیار کرلی ہے۔ لڑکا جتنا زیادہ بڑی تعلیمی ڈگری رکھتا ہو، یا جتنا زیادہ بڑی کمائی والا ہو، اتنا ہی زیادہ شادی کے بازار میں اس کی قیمت بڑھتی چلی جاتی ہے۔

پہلے لڑکی کے والدین لڑکی کو ضروری استعمالی اشیاء بطور جہیز دیتے تھے۔ اب اس میں ناقابلِ بیان حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ مثلاً صوفہ سیٹ، ڈنرسیٹ، کوکنگ رینج، ٹیلی وژن، موٹر سائیکل، ریفریجیٹر، کار، وغیرہ، وغیرہ۔ تاہم اسی پر بس نہیں۔ اسی کے ساتھ خاطب (لڑکا) مخطوبہ (لڑکی) سے بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کرتا ہے یا متوقع رہتا ہے، جس کی تکمیل کے بغیر شادی لڑکی کے لیے بربادی کے ہم معنی بن جاتی ہے۔

ان بھاری رسموں کا نتیجہ یہ ہے کہ شادی ایک ایسا تعیش بن گئی ہے جو صرف چند خوش نصیب افراد کے بس میں ہو۔ بے شمار والدین ہیں جو اپنے آپ کو اپنی لڑکیوں کا نکاح کرنے کے لیے بے بس پا رہے ہیں۔ ان کے سامنے ان کی جوان لڑکیاں حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی ہیں۔ مگر ان کے امکان میں نہیں کہ شادی کے بازار میں بھاری رقم ادا کرکے ان کے لیے شوہر پاسکیں۔ چنانچہ ایسی مثالیں سامنے آرہی ہیں کہ لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں۔ مرتد ہو جاتی ہیں۔ اور دوسری برائیوں میں پڑجاتی ہیں جن کو بیان کرنے کی قلم میں طاقت نہیں۔

جہیز کی یہ صورتیں سادہ طور پر صرف سماجی برائی نہیں ہیں۔ وہ یقینی طور پر ناجائز اور حرام ہیں۔ یہ ایسے اعمال ہیں جن کے ساتھ آدمی کا نماز روزہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں کیا جاتا۔

قدیم زمانہ میں موجودہ قسم کے جہیز کا رواج نہ تھا جس میں لڑکی کا والد لڑکے کو سامان اور نقد رقم ادا کرتا ہے۔ تاہم یہ رسم برعکس صورت میں جزئی طور پر پائی جاتی تھی۔ یعنی لڑکی والوں کے مطالبہ پر لڑکے والے کچھ سامان یا نقد لڑکی کو ادا کرتے تھے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم زمانہ زراعتی زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں مال اور کمائی کے اعتبار سے وہ غیر معمولی فرق نہ تھا جو آج پیدا ہو گیا ہے۔ قدیم زمانہ کی عورت زراعت کے چھوٹے اور ہلکے کام کرتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں مرد زیادہ بڑے اور بھاری کام کرتا تھا۔ اس طرح دونوں صنفوں میں جو فرق تھا وہ صرف کچھ ڈگری کا تھا۔

اب موجودہ زمانہ میں کمائی کے نئے اور اتھاہ مواقع پیدا ہو گیے ہیں۔ مگر عورت (خاص طور پر مشرقی معاشرہ کی عورت) بڑی حد تک اپنے سابقہ مقام پر ہے۔ جب کہ مرد کمائی کے اعتبار سے کم از کم امکانی طور پر، ناقابل بیان حد تک آگے بڑھ گیا ہے۔ اس صورت حال نے شادی کے بازار میں عورت کی اہمیت گھٹا دی ہے۔ اور مرد کی اہمیت اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھا دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب لڑکی والے مطالبہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اب یہ حیثیت تمام تر لڑکے کی طرف چلی گئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، قدیم زمانہ میں زیادہ تر خاطب (لڑکے) سے جہیز کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اس وقت علماء سے اس کی بابت فتویٰ پوچھا گیا تو انھوں نے اس کو رشوت قرار دیا۔ بوقت نکاح اس قسم کی رقم لینے اور دینے کو انھوں نے حرام بتایا اور اس کو اس حدیث کے تابع ٹھہرایا: لعن اللہ الراشی والمرتشی۔

مجموعہ فتاویٰ مولانا عبدالحیٔ (۲/۴۷) میں اس نوعیت کے ایک استفتاء کے جواب میں یہ مسئلہ نقل کیا گیا ہے:

لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی۔ ومن الرشوۃ ما اخذہ ولی المرأۃ قبل النکاح، اذا کان بالسؤال اوکان اعطاء الزوج بناءً علی عدم رضائہ علی تقدیر عدمہ۔
(الوسیلۃ الاحمدیہ شرح الطریقۃ المحمدیہ)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے پر لعنت کی ہے۔ اور عورت کا سرپرست نکاح سے پہلے جو کچھ لے وہ بھی رشوت ہے، خواہ مطالبہ کر کے لے، یا شوہر اس وجہ سے دے کہ اس کے بغیر عورت کا سرپرست نکاح پر راضی نہ تھا۔

موجودہ زمانہ میں لوگ شادی کے موقع پر نہایت اطمینان کے ساتھ بڑے بڑے سامان

اور رقمیں لیتے ہیں۔ انھیں خیال نہیں آتا کہ اس میں کوئی ہرج ہے۔ حالاں کہ یہ عین اس حدیث کا مصداق ہے جو صحیح بخاری میں آئی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا جب کہ آدمی جو کچھ لے گا اس کے بارہ میں اس کو یہ پروا نہ ہوگی کہ وہ حلال ہے یا حرام (یأتی علی الناس زمان لایبالی المرءُ ما اخذ منه أمن الحلال ام من الحرام) مشکاۃ المصابیح، الجزء الثانی، صفحہ ۸۴۲

شادی کے معاملہ میں نمائشی اور مسرفانہ رسمیں جو آج کل مسلمانوں میں رائج ہیں، ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تمام تر ملک کی غیر مسلم قوموں کے زیر اثر اختیار کی گئی ہیں۔ یہ سب تشبہ بالاجانب ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انھیں میں سے ہے (من تشبّه بقوم فهو منهم)

کوئی عالم اگر دھوتی پہن کر بازار میں نکلے تو تمام مسلمان چیخ اٹھیں گے۔ مگر اس سے زیادہ بڑے بڑے معاملات میں تمام عالم اور غیر عالم غیر قوموں کی نقل کر رہے اور اس پر کوئی چیخ بلند نہیں ہوتی۔

مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے حیاۃ الصحابہ (جلد دوم) میں ایک باب اس عنوان کے تحت قائم کیا ہے: نکاح میں کافروں کی مشابہت پر انکار۔ اس کے ذیل میں انھوں نے ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

الانکار علی من تشبّه بالکفرة فی النکاح

اخرج ابو الشیخ فی کتاب النکاح عن عروة بن رُوَیم ان عبد الله ابن قُرط الثُمالی رضی الله عنه کان یعسُّ بحمص ذات لیلة۔ وکان عاملاً لعمر رضی الله عنه فمرّت به عروس و هم یوقدون النیران بین یدیها، فضربهم بدرته حتی تفرقوا عن عروسهم، فلما اصبح قعد علی منبره فحمد الله واثنی علیه فقال: ان ابا جندلة نکح اُمامة فصنع لها حثیات من طعام، فرحم الله ابا جندلة وصلی علی اُمامة، ولعن الله عروسکم البارحة! اوقدوا النیران، وتشبهوا بالکفرة والله مطفئ نورهم۔ قال: وعبد الله بن قرط من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم۔ کذا فی الاصابة (۳۸/۴)

عُروہ بن رُویم کہتے ہیں کہ عبداللہ بن قُرط ثمالیؓ حمص میں ایک رات خبر گیری کے لیے پھر رہے تھے۔ وہ خلیفہ ثانی عمر بن خطابؓ کی طرف سے وہاں کے حاکم تھے۔ انھوں نے دولہا دلہن کی ایک بارات گزرتے ہوئے دیکھی۔ لوگ اس کے آگے آگ جلا کر چل رہے تھے۔ حضرت عبداللہ نے ان کو اپنے درہ سے مارا، یہاں تک کہ وہ لوگ بھاگ گیے۔ جب صبح ہوئی تو وہ اپنے منبر پر بیٹھے۔ انھوں نے اللہ کی حمد وثنا کی اور کہا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو جندلہ نے اُمامہ سے نکاح کیا۔ اور ان کے لیے تھوڑا سا کھانا تیار کیا۔ تو اللہ ابو جندلہ پر رحم کرے اور اُمامہ پر بھی رحمت فرمائے۔ اور اللہ گزشتہ رات کے تمھارے دولہا دلہن پر لعنت کرے۔ انھوں نے آگ روشن کی اور کافروں کے ساتھ مشابہت اختیار کی۔ مگر اللہ ان کی روشنی کو بجھا دینے والا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ عبداللہ بن قُرط رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے تھے۔

ایک وقت تھا کہ شادی میں نسبتاً کم تر درجہ کی غلط رسوم پر اسلام کے حاکم لوگوں کو کوڑے مارتے تھے، اور علماء ان کے حرام ہونے کا فتویٰ دیتے تھے۔ آج ان سے بہت زیادہ غلط رسوم مسلم شادیوں میں عام طور پر رائج ہو گئی ہیں، مگر ان کے خلاف کوئی اٹھنے والا نہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ بظاہر اس کے خلاف بولتے ہیں، وہ بھی اس وقت اسی جاہلانہ دھوم میں شریک ہو جاتے ہیں جب کہ یہ دھوم ان کی اولاد یا ان کے اپنے لوگوں کی طرف سے کی گئی ہو۔

ایثار اور قربانی کی تجدید

عید اضحیٰ کا تیوہار، دوسرے تاریخی تیوہاروں کی طرح، ایک بڑے تعمیری اور انقلابی واقعہ کی یادگار ہے۔ ہر سال ہجری کلنڈر کے آخری مہینہ میں اس دن کو عید اضحیٰ کے طور پر اس لیے منایا جاتا ہے کہ لوگ اس دن پیش آنے والے عظیم واقعہ کو یاد کریں اور اس کو اپنی زندگیوں میں داخل کرنے کا عہد کریں۔ یہ دن، ایک لفظ میں، ایثار اور قربانی کی یادگار ہے، وہ ایثار اور قربانی کی تجدید کا دن ہے۔

عید اضحیٰ جس عظیم واقعہ کی یادگار ہے، وہ تقریباً چار ہزار سال پہلے پیش آیا۔ ابوالانبیار حضرت ابراہیم علیہ السلام، جو عراق کے متمدن ملک میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ایک اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنے بیٹے اسماعیل کو قربان کر دیا۔ یہ قربانی حقیقۃً جسم پر لوہے کی چھری چلانا نہ تھا بلکہ اپنی پوری زندگی پر صبر کی چھری چلانے کے ہم معنی تھا۔ یہ حق کی خاطر اپنی ذات کو نظر انداز کرنا تھا۔ یہ ایک بڑے مقصد کی خاطر چھوٹے تقاضوں کو چھوڑ دینا تھا۔ یہ اپنی منزل کی طرف ہر حال میں آگے بڑھنا تھا، خواہ اس کے لیے اپنی عزیز ترین متاع سے دست بردار ہو جانا پڑے۔

عید اضحیٰ کی مناسبت (relevance) ہمارے لئے کیا ہے۔ اور یہ دن ہم سے کس قسم کے ایثار و قربانی کا تقاضا کرتا ہے، اس کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کی حقیقت کیا تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی اہمیت کو جاننے کے بعد ہی ہم اپنی زندگیوں میں اس کی اہمیت کو جان سکتے ہیں۔ اور اس کو عملی طور پر اختیار کر سکتے ہیں۔

ابتدائی طور پر حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کا واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خواب کے مطابق اپنے عزیز بیٹے اسماعیلؑ کو ذبح کر دینا چاہا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے روک دیا۔ اسماعیلؑ کی جان کے فدیہ کے طور پر انہیں مینڈھا ذبح کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اور حضرت اسماعیلؑ کے لیے یہ حکم ہوا کہ ان کو لے جا کر عرب کے صحرا میں بسا دیں

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اصل منشا بیٹے کا وقتی جسمانی ذبیحہ نہ تھا بلکہ اس کا مستقل نفسیاتی ذبیحہ تھا۔ کیونکہ اس وقت عرب کے صحرا میں کسی ذی حیات کو بسانا اس کو مستقل طور پر ذبح کی حالت میں ڈال دینے کے ہم معنی تھا۔

اللہ تعالیٰ کا یہ منصوبہ تھا کہ ایک وسیع اصلاحی انقلاب دنیا میں لایا جائے جو ساری انسانیت کے لئے خیر و فلاح کا باعث ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کے افراد کی ایک ٹیم درکار تھی۔ اسی طاقتور ٹیم کو تیار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے خاندان کو استعمال فرمایا۔

اس مقصد کے لیے ضرورت تھی کہ ایک ایسا انسانی گروہ تیار کیا جائے جو تمدنی خرابیوں سے پاک ہو۔ جس کے اندر فطری انسانی اوصاف زندہ ہوں۔ جو ان تمام اعلیٰ خصوصیتوں کا مجموعہ ہو جس کو المروءۃ (مردانگی) کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی نسل شہر کی مصنوعی فضا میں نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے لئے فطرت کا سادہ ماحول درکار تھا۔ یہی منصوبہ ہے جس کی تکمیل ابراہیم اور اسماعیل علیہما السّلام کے ذریعہ انجام پائی۔ حضرت ابراہیم نے اس اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنے بیٹے کو قربان کر دیا۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے بیٹے کو عراق کی تمدنی فضا سے نکالا اور ان کو لاکر عرب کے غیر آباد علاقہ میں ڈال دیا۔ اس وقت وہاں ریت اور پتھر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ پانی نہ ہونے کی وجہ سے وہاں زندگی کا کوئی سامان پایا نہ جاتا تھا۔ تاہم اس بے سامان ماحول میں سب سے بڑا سامان موجود تھا — وہ سادہ ماحول جہاں انسان اپنی فطرت پر پرورش پاتے، جہاں اس کے پیدائشی انسانی اوصاف کو آزادانہ ترقی کرنے کا موقع ملے۔

اللہ تعالیٰ نے اس خشک اور خالی علاقہ کو مطلوبہ نئی نسل تیار کرنے کے لئے منتخب کر لیا۔ یہ گویا ایک عظیم صحرائی تربیت گاہ تھی جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے اسماعیل کو لاکر بسا دیا۔ حضرت اسماعیل جب بڑے ہوئے تو انہوں نے ایک صحرائی لڑکی سے نکاح کر لیا۔ اس طرح اس صحرائی ماحول میں وہ نسل بننا شروع ہوئی جو بعد کو بنو اسماعیل کہلائی۔

یہی بنو اسماعیل ہیں جن کے منتخب افراد کا نام اصحاب رسول ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اسی قوم (بنو اسماعیل) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ان کو توحید کے نظریہ پر جمع کیا اور پھر ان کو لے کر وہ عالمی اسلامی انقلاب برپا کیا جس نے انسانی تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ یہ بنو اسماعیل تاریخ کے انوکھے لوگ تھے جو اعلیٰ انسانی اوصاف کا کامل نمونہ تھے۔ پروفیسر فلپ ہٹی نے بجا طور پر ان کو ہیروؤں کی نرسری (nursery of heroes) کہا ہے۔

عیداضحیٰ کے دن جانور کی جو قربانی دی جاتی ہے وہی اصل قربانی نہیں ہے۔ وہ اصل قربانی کی صرف ایک علامت ہے۔ اصل میں تو ہمیں خود اپنے آپ کو قربان کرنا ہے۔ جانور کی قربانی علامتی قربانی ہے۔ وہ اس لئے کرائی جاتی ہے تاکہ لوگوں میں قربانی کی اعلیٰ روح زندہ رہے۔ تاکہ وہ ایک عملی واقعہ کے ذریعہ اس کو یاد کرتے رہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور اس مقصد کی طرف انہیں کس طرح آگے بڑھنا ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو قربانی دی، اس کی حیثیت ایک اعلیٰ مثال کی ہے۔ تاہم اس کی پیروی ہمیں اس کی اصل روح کے اعتبار سے کرنا ہے نہ کہ اس کی ظاہری شکل کے اعتبار سے۔ اس مثال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں قربانی کرنے والے لوگ اس کی ظاہری پیروی میں صحرا میں جاکر بس جائیں اور وہاں اس پُرمشقت تاریخ کو دہرانا شروع کردیں جو حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کے ساتھ قدیم عرب میں پیش آئی تھی۔ بعد کے زمانہ کے لوگوں کو اس قربانی کی اسپرٹ کو اپنانا ہے۔ اس واقعہ کی شکل زمانی ہے۔ مگر اس کی جو اسپرٹ ہے وہ دوامی اہمیت رکھتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے انسانیت کے بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے یہ کیا کہ وہ اپنے آپ کو متمدن دنیا سے نکال کر غیر آباد صحرا میں لے گئے۔ سرسبز و شاداب عراق کو چھوڑ کر وہ عرب کے خشک بیابان میں جا بسے۔ ظاہری فرق کے ساتھ یہی قربانی اپنے دائرہ میں ہر شخص سے مطلوب ہے۔ ہر ایک کا ایک "سرسبز عراق" ہے۔ اور

ہر ایک کو اپنے سرسبز وشاداب عراق کو چھوڑ کر "صحرائے عرب" میں جاکر آباد ہو جانا ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آج کے حالات میں یہ ابراہیمی واقعہ کس پہلو سے مطلوب ہے اور خدا ہم سے کس قربانی کا مطالبہ کر رہا ہے۔ آج کے حالات میں بہتر دنیا کی تعمیر کے لیے افراد سے جو قربانی مطلوب ہے وہ اپنی شکل کے اعتبار سے خواہ جو بھی ہو، مگر اپنی روح کے اعتبار سے وہ ابراہیمی قربانی قرار پائے گی۔ اور اس میں فنائیت کا ثبوت دینے والے کو وہی کریڈٹ ملے گا جس کو قربانی کہا جاتا ہے۔

اب اس لحاظ سے سوچیئے کہ آج کے حالات میں سنت ابراہیمی کو ادا کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے۔ وہ کون سی قربانی ہے جو آج کے حالات میں ہم سے مطلوب ہے۔

ابراہیمؑ و اسماعیل علیہما السلام نے ایک بہت مخصوص اور منفرد قسم کی قربانی پیش کی تھی۔ یہ ایک انتہائی انداز کی قربانی تھی جیسی قربانی دوبارہ کوئی شخص پوری انسانی تاریخ میں پیش نہ کر سکا۔ اس طرح یہ تمام انسانوں کے لیے ایک ممتاز اور معیاری نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح آئندہ تمام لوگوں کو اپنے اپنے دائرہ میں اور اپنے اپنے امکان کے بقدر قربانی پیش کرنا ہے۔ عید اضحیٰ کا دن ہر شخص کو اسی ذمہ داری کا سبق دیتا ہے۔

اس ایثار و قربانی کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بھی ہو سکتی ہے اور بڑی سے بڑی بھی۔ بس میں سفر کرتے ہوئے جب آپ ایک خاتون یا ایک بوڑھے مسافر کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی سیٹ دوسرے انسان کے حوالے کر دیتے ہیں تو یہ بھی ایک قربانی ہے۔ آپ ایک ادارہ میں عہدیدار ہیں۔ آپ کے سامنے ایک زیادہ بہتر شخص آتا ہے۔ آپ عہدہ کی کرسی اس کی خاطر چھوڑ دیتے ہیں تو یہ بھی ایک قربانی ہے۔ آپ کے اندر ایک شخص کے خلاف غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکتی ہے۔ آپ اپنے غصہ اور نفرت کی آگ کو صبر و برداشت کے پانی سے بجھا دیتے ہیں تو یہ بھی ایک قربانی ہے۔ آپ کے پاس مادی وسائل زیادہ ہیں اور آپ کے ایک بھائی کے پاس کم۔ آپ اپنے

مادی وسائل کا ایک حصہ اپنے بھائی کو دے دیتے ہیں تو یہ بھی ایک قربانی ہے۔ اس طرح قربانیوں کا یہ سلسلہ پوری زندگی میں اور ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس قربانی کے بغیر بہتر سماجی زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

زندگی میں کوئی بڑا کام کبھی قربانی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ ہر بڑا کام لازمی طور پر فنائیت مانگتا ہے۔ قوم کو اوپر اٹھانے کے لیے اپنے آپ کو پیچھے کر لینا، ملک کی ترقی کے لیے ذاتی نقصان کو گوارا کر لینا، انسانیت کو اونچا کرنے کے لیے اپنے جھنڈے کو نیچا کر لینا، اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے اپنی خواہشات کو دبانا، اصول کو قائم کرنے کی خاطر اپنی انا کو کچل دینا، پڑوسی کو امن دینے کی خاطر اپنے آپ پر پابندی لگانا، اس طرح کی تمام چیزیں قربانی کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہی وہ قربانی ہے جس کی اہمیت کو بتانے کیلئے عید اضحیٰ کا تیوہار منایا جاتا ہے۔

نوٹ: یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۱۴ جولائی ۱۹۸۹ء کو نشر کی گئی۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

ISLAM

In Contemporary Language

AL-RISALA monthly has a two-fold aim: first, to introduce Islam as a divine message; second, to promote positive and constructive thinking among the people. It is published in Urdu and English by the Islamic Centre, New Delhi.

To receive your copies of this thought-provoking magazine regularly, subscribe NOW.



Ask for a free sample copy.

Please send AL-RISALA to me/my friend/relative at the following address:

Name: ____________________

Address: ____________________

____

____

Please send a free sample copy of AL-RISALA at the following address:

____

____

____

(Please use a separate sheet for more than one address)

☐ Please send a publications catalogue

Please tick box where applicable

☐ Urdu ☐ 1 year ☐ 3 years
☐ English ☐ 2 years ☐ 5 years
☐ Air-mail ☐ Surface-mail

I am enclosing Cheques/Bank Draft/ Postal Order/M.O. Receipt No. ________

Subscription Rates

INLAND	ABROAD AIRMAIL	ABROAD SURFACE MAIL
1 year Rs 60	Rs 400/$25/£15	Rs 200/$15/£8
2 years Rs 110	Rs 700/$45/£25	Rs 350/$25/£15
3 years Rs 150	Rs 1000/$65/£40	Rs 500/$35/£20
5 years Rs 240	Rs 1500/$100/£60	Rs 750/$55/£30

Pakistan Rs 150 for one year

Supporting Subscription (For One Year)

INLAND .... Rs 300
ABROAD (By Air-mail) .... $100/£60

Please send this together with the payment to the Circulation Manager.

AL-RISALA, The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

RNI 28822/76 □ March 1990 No 160 □ Rs. 5

Delhi Postal Regd No D(SE) 243
U(SE) 12/86